UNIVERSAL
LIBRARY
OU_224957
UNIVERSAL
LIBRARY

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

۷۸۶

واعدوا لهم ما استطعتم من قوة

ضرورتِ وقت

یعنی

ضعفِ ملی کا علاج

مصنفہ

محمد تیمور، ایم اے

پروفیسر اسلامیہ کالج پشاور

قیمت فی جلد ایک روپیہ

روز بازار الیکٹرک پریس ہال بازار امرتسر میں شیخ عبدالعزیز پرنٹر کے اہتمام سے چھپا

فہرستِ ابواب

صفحہ

پہلا باب۔ ہندوستان کے لوگوں نے انگریزی زبان اور مغربی علوم کو کن اغراض سے حاصل کیا۔ اور گورنمنٹ انگریزی اور مشنریوں نے مغربی علوم کی ترویج و ترقی میں کیا مصالح سمجھے۔ ۳
دوسرا باب۔ مغربی علوم کے اقسام اور ان کے فوائد کا مقابلہ ہندوستان کی توجہ کن علوم کی طرف ہے۔ ۴۰
تیسرا باب۔ ہندوستان میں صنعت کی پست حالت اور اسکے اسباب ۷۵
چوتھا باب۔ صنعتی پستی کے متعلق گورنمنٹ اور اہلِ ملک کی ذمہ داری ۱۲۳
پانچواں باب۔ عملی تجاویز۔ ۱۶۹
چھٹا باب۔ قومی ترقی کے لئے کن اخلاق کی ضرورت ہے۔ ۱۷۶

افتتاحیہ

ہم نے یورپ سے کیا سیکھا ہے۔ کیا سیکھنا چاہئے تھا۔ اور آئندہ توجہ کس طرف ہونی چاہئے؟ یہ ایک سوال ہے۔ جو اکثر لوگوں کے دل میں ہے۔ اس رسالے میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ امید ہے۔ کہ یہ بحث دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ قومی ترقی کے لئے آج کل بہت لوگوں کے دل بے تاب ہو رہے ہیں۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے کئی راستے ہیں۔ جن کو مختلف جماعتوں نے اختیار کر رکھا ہے۔ ہر شخص کا فرض ہے۔ کہ جن باتوں کو قوم کے لئے مفید سمجھتا ہے۔ اُن کا بلاخوف اظہار کرے۔ اور موجودہ طریقوں میں جو سقم یا کمزوری ہو۔ اُس کو بھی ظاہر کر دے۔ مَیں نے بھی اس فرض کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس تحریر کے سب سے بڑے محرک کئی نوجوان ہیں۔ جن کو مَیں ذاتی طور سے جانتا ہوں۔ کہ اُن کے دلوں میں قوم کی محبت بھری ہوئی ہے۔ ان کے قلوب نفسانی اغراض سے پاک ہیں۔ اور وہ قوم کے لئے کام کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے بہتوں نے اپنے دینوی فوائد کو قربان کر دیا ہے۔ اور قوم کے لئے ہر قسم کی تکالیف برداشت کر رہے ہیں۔ وہ ابھی اس عمر کو نہیں پہنچے۔ کہ دنیاوی اغراض ان کی خالص محبت کو ملوث کر سکیں۔ ایسی ہستیوں کو دیکھ کر مَیں مجبور ہو گیا۔ کہ ان کے سامنے ایک راستہ پیش کروں۔ جو شاید دوسرے راستوں سے بہتر ہو۔ اگرچہ قومی اغراض کے لئے افراد کا اپنی زندگیوں کو قربان کر دینا بعض اوقات ایک لازم امر ہو جاتا ہے۔ مگر کسی مفید ہستی کا تدبیر کی غلطی

کی وجہ سے ضائع ہو جانا ہمیشہ قابل افسوس ہوگا۔ اور ایسی قربانیاں جن سے بہت کم فائدے کی امید ہو۔ یقیناً ضرر رساں ہیں۔

میں نے موجودہ حالات کے لحاظ سے یورپین صنعت کے حصول اور قومی نظام کے قائم کرنے کو باقی تمام سیاسی و غیر سیاسی تحریکوں پر مقدم سمجھا ہے۔ میں نے اپنے مطالب کو وضاحت کیساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور کسی قسم کا ابہام نہیں رکھا۔ مگر پھر بھی مجھے ڈر ہے۔ کہ سطحی نظر میں بہت سے مطالب فوت ہو جائیں گے۔ عمیق نگاہ والوں کے لئے خواہ وہ مجھ سے متفق نہ بھی ہوں غور کرنے کی بہت سی باتیں ہیں۔ آخر میں میں اپنے دوست پروفیسر محمد حسین حکیم ایم اے کا شکریہ ادا کرنا فرض سمجھتا ہوں۔ کہ انہوں نے چھپنے سے پہلے مسودے کو بغور پڑھ کر بہت سی ضروری اصلاحوں کی طرف مجھے توجہ دلائی۔

اسلامیہ کالج پشاور

۱۹ رمئی ۱۹۲۲ء

پہلا باب

ہندوستان کے لوگوں نے انگریزی زبان اور مغربی علوم کو کن اغراض سے حاصل کیا

اَور

گورنمنٹ انگریزی اور مشنریوں نے مغربی علوم کی ترویج و ترقی میں کیا مصالح سمجھے

جب ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ تو ضروری تھا۔ کہ حاکم و محکوم کی کوئی مشترک زبان ہو۔ ابتدا میں انگریزوں نے فارسی زبان کو ہی استعمال کیا۔ کیونکہ سلطنت مغلیہ کے وقت میں دفاتر کی زبان یہی تھی۔ اور اس زبان کے جاننے والے تجربہ کار اہلکار جو سلطنت کے انتظامی کاموں کو بخوبی سرانجام دے سکیں۔ کثرت سے مِل جاتے تھے۔ چنانچہ وارن ہیسٹنگس کے وقت میں اور اِسکے بعد بھی مدت تک انگریزی دفاتر کی زبان فارسی تھی۔

انگریزی زبان کو ہندوستان میں رواج دینے کا خیال سب سے پہلے پادری لوگوں میں پیدا ہوا۔ جن کی غرض ہندوستان میں مذہب عیسائیت کی اشاعت کرانا تھا۔ ۱۷۹۲ء میں چارلس گرانٹ نے ایک کتاب لکھی۔ جس میں اس نے تحریک کی کہ ہندوستانیوں کو انگریزی زبان کی تعلیم دینی چاہیئے۔ ۱۸۱۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے ایک لاکھ روپیہ سالانہ ہندوستانیوں کی تعلیم پر خرچ کرنے کی منظوری دی۔ ۱۸۱۳ء سے ۱۸۳۵ء تک یہ معاملہ زیر بحث رہا۔ کہ آیا یہ تعلیم مشرقی علوم کی ہو یا مغربی علوم کی۔ مگر چونکہ انگریز افسروں میں مشرقی تعلیم کے حامیوں کی رائے غالب رہی۔ اس لئے ۱۸۳۵ء تک گورنمنٹ نے انگریزی تعلیم کے لئے کوئی کوشش

نہ کی۔ اور یہ روپیہ کلکتہ مدرسہ۔ سنسکرت کالج اور مشرقی علوم کی پرانی کتابوں کے چھاپنے پر خرچ ہوتا رہا۔ ۱۸۳۵ء میں میکالے نے کمیٹی تعلیم کے صدر کی حیثیت سے روئیداد لکھی جس میں اس نے زور دیا۔ کہ ہندوستانیوں کو انگریزی زبان میں مغربی علوم کی تعلیم دی جائے۔ لارڈ ولیم بنٹنگ گورنر جنرل نے میکالے کی تجویز کو اختیار کرکے احکام صادر کئے۔ کہ آئندہ کے لئے تمام روپیہ جو تعلیم کے لئے منظور ہو۔ ایسے کالجوں اور سکولوں پر خرچ کیا جائے۔ جن میں مغربی علوم کی تعلیم انگریزی زبان میں دی جائے۔ [1]

مگر یہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم کی ابتدا نہ تھی اس سے پہلے بہت سے انگریزی تعلیم کے مدارس قائم ہو چکے تھے۔ اور بہت سے بنگالی انگریزی زبان اور علم ادب میں مہارت پیدا کر چکے تھے۔ ۱۸۱۶ء میں ڈیوڈ ہیر اور راجہ رام موہن رائے نے ایک کمیٹی بنائی۔ جس میں انگریز اور ہندوستانی شامل تھے۔ اور روپیہ جمع کرکے انہوں نے ۱۸۱۷ء میں ایک کالج قائم کیا۔ جس کا نام ہندو کالج رکھا گیا۔ رام موہن رائے خود انگریزی زبان کا ماہر تھا۔ اور جن ذرائع سے اس نے انگریزی علوم سیکھے تھے۔ قیاس چاہتا ہے۔ کہ اور منتخب لوگوں نے بھی اسی طرح انگریزی علوم کو بغیر سکولوں۔ اور کالجوں کی وساطت کے حاصل کیا ہو۔ اس کے بعد ۱۸۱۸ء میں پہلا مشنری کالج سیرام پور میں قائم ہوا۔ ۱۸۲۰ء میں بشپ کالج سبب پور میں قائم ہوا۔ ۱۸۳۰ء میں الیگزنڈر ڈف ایک سکاٹلینڈ کے مشنری نے کلکتہ میں سکاٹش چرچ سکول و کالج قائم کیا۔ غرض مشنریوں اور ہندو ریفارمروں کی کوشش سے ۱۸۲۰ء اور ۱۸۳۰ء کے درمیان نئے خیالات کا چرچا کلکتہ میں زور و شور سے ہو رہا تھا۔ [2]

---

[1] رپورٹ کلکتہ یونیورسٹی کمیشن ۱۹۱۷ء-۱۹ء جلد اول صفحات ۳۱-۳۲ [2] ایضاً ص ۳۳ و ۳۴

۱۸۲۳ء میں رام موہن رائے نے لارڈ امہرسٹ کو میموریل دیا جس میں اس نے مغربی تعلیم جاری کرنے پر زور دیا۔ اور افسوس ظاہر کیا۔ کہ سنسکرت کالج میں انگریزی تعلیم کا کوئی حصہ نہیں رکھا گیا۔ ۱۸۳۱ء میں تعلیم کی کمیٹی نے رپورٹ کی۔ کہ انگریزی زبان کا شوق عام ہو گیا ہے۔ اور ہندو کالج کے تعلیم یافتہ نوجوانوں نے ہر علاقہ میں انگریزی سکول کھول دئے ہیں۔ کلکتہ بک سوسائٹی کی رپورٹ ہے۔ کہ ۳۵-۱۸۳۴ء میں جہاں دیسی زبانوں کی ایک کتاب بکی۔ وہاں انگریزی کی دو بکیں۔ ۵۳ ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ انگریزی تعلیم کا رواج گورنمنٹ کی کوشش کے بغیر ہی ہو گیا تھا۔ اور بعد میں گورنمنٹ نے اسی پالیسی کو بہتر سمجھ کر اختیار کیا۔ شمالی ہندوستان میں سب سے پہلے انگریزی زبان کا رواج بنگال ہی میں ہوا۔ اور باقی صوبوں کو تعلیم دینے اور اپنے نمونے سے انگریزی علوم کی طرف راغب کرنے والے اہل بنگال ہی ہیں۔ اسی لئے تمام شمالی ہندوستان میں لفظ بابو جو بنگالی زبان کا لفظ ہے۔ انگریزی دان کے مترادف کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

اب ہمارے سامنے دو اہم سوال درپیش ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہندوستان کے لوگوں نے انگریزی زبان اور مغربی علوم کو کن اغراض سے حاصل کیا۔ اور دوسرا یہ کہ گورنمنٹ انگریزی اور مشنریوں نے مغربی علوم کی ترویج و ترقی میں کیا مصالح سمجھے۔ پہلے سوال کا جواب ایسا مشکل نہیں۔ جیسا دوسرے کا۔ پہلے سوال کے ہم خود ہی سائل ہیں۔ اور خود ہی مجیب۔ مگر دوسرے سوال کے حقیقی مجیب گورنمنٹ اور پادری صاحبان ہیں۔ پادری صاحبان

---

۵۳ کلکتہ یونیورسٹی کمیشن رپورٹ ۱۸-۱۹۱۶ء جلد اول باب ۲ صہ ۸۳

کا عندیہ تو ظاہر ہے۔ مگر گورنمنٹ کے عندیات پر صحیح رائے قائم کرنا ایک بڑا مشکل کام ہے۔ اس گورنمنٹ پر حصر نہیں۔ کسی گورنمنٹ کے عندیات کی نسبت بھی ظن غالب سے بڑھ کر رائے نہیں دی جا سکتی۔

ہندوستانیوں کے انگریزی زبان کی طرف مائل ہونے کی پہلی وجہ یہ تھی۔ کہ انگریز فاتح اور ہندوستانی مفتوح تھے۔ اور مفتوح قوموں کو فاتح قوموں کا نمونہ اختیار کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ فاتحین ایسے معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے عالم بالا کی مخلوق ہیں۔ اور مخلوق بھی نہیں بلکہ خالقین نظر آتے ہیں۔ اسی لئے ان کا لباس۔ ان کی زبان ان کا انداز گفتگو محبوب معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ سب نقل کر لیا جاتا ہے یہ قاعدہ صرف فاتحین تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ ہر شخص یا قوم جو کسی طریق سے بھی دوسری قوموں پر اپنی فوقیت ثابت کر دے اور ممدوح بن جائے۔ تو ان کے مداح اپنے آپ کو ان کے رنگ میں رنگین کرنا چاہتے ہیں۔ فاتح بھی اپنی جرأت و قوت اور غلبہ کی وجہ سے فوقیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور مغلوب قوموں کے ممدوح ہوتے ہیں۔ چنانچہ انگریزی لباس ہندوستان میں زیادہ تر اسی وجہ سے اختیار کیا گیا۔ حالانکہ ابتدا میں پرانے خیال کے لوگ اس کو مذموم سمجھتے تھے۔ ہندوستان میں انگریزی زبان کے سیکھنے اور سکھانے کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ مگر اس سبب کا اثر اتنا وسیع نہیں ہوا۔ جتنی وسیع ہندوستان میں انگریزی تعلیم ہے دوسری وجہ اس سے قوی ہے۔ اور وہ مفتوحین کی محتاجی ہے۔ مفتوح قومیں اپنی زندگی اور آرام و آسائش کے لئے اس بات کی محتاج ہوتی ہیں۔ کہ اپنے معروضات فاتحین کے کانوں تک ایسے بہتر طریق سے پہنچائیں۔ کہ وہ بخوبی سمجھ لیں۔ اور ان کی حاجات کو پورا کریں۔ ہر محتاج کی یہ کوشش ہوتی ہے۔ کہ اپنے

قبلہ حاجات کی زبان سیکھے۔ اور نہ صرف زبان سیکھے۔ بلکہ اس کے مزاج اور اس کی پسندیدگیوں اور ناپسندیدگیوں پر آگاہ ہو۔ اس اصول پر بھی ہندوستانیوں میں انگریزی زبان کے سیکھنے کی تحریک ہوئی۔ اور بہت سے لوگوں نے اسی غرض سے انگریزی زبان کو سیکھا۔ کسی زبان کے سیکھنے کی یہ دو وجہیں ایسی عام ہیں۔ کہ ہندوستان کے باہر بھی جہاں کہیں دو قوموں یا شخصوں کی یہ حالت و تعلقات ہونگے۔ جو ہندوستان میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے ہیں۔ تو ضرور مداح ممدوح کی اور حاجتمند محتاج الیہ کی زبان اختیار کرنے کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ اہل فرانس چونکہ اپنے علوم و فنون کے لئے یورپ میں ممتاز تھے۔ اس لئے فرانسیسی زبان کا سیکھنا اور بولنا تمام یورپ کے ممالک میں فیشن میں داخل ہو گیا تھا۔ اور بہت سے لوگ خصوصاً شاہزادے اور شاہزادیاں جن کو علوم سے کچھ غرض نہ تھی فرانسیسی زبان صرف اس لئے سیکھتے تھے۔ کہ یہ ممدوح قوم کی زبان ہے اور اس لئے خود بھی ممدوح ہے۔ محتاجی کی مثال خود پیرس میں موجود ہے۔ جہاں انگریزی زبان کے بولنے والے ملازم ہر ہوٹل میں ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اہل امریکہ کثرت سے پیرس میں آتے ہیں۔ اور ان سے اہل پیرس کو مفاد کی توقعات ہوتی ہیں۔ اس لئے ان کے آرام و آسائش کے لئے وہ خود ان کی زبان سیکھتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ ان کو اپنی زبان سیکھنے پر مجبور کریں ہندوستان میں بھی ہندوستانیوں کو ضرورت ہے۔ کہ وقتاً فوقتاً اپنی شکایات اور تکالیف کا اظہار گورنمنٹ کے پاس کریں۔ بڑے بڑے انگریز عہدہ داروں کے سامنے ایڈریس پیش کریں۔ اور وہ انہی کی زبان میں ہوں۔ اسی لئے ہندوستانیوں کے سب اعلیٰ درجہ کے اخبار انگریزی زبان میں ہیں۔ حالانکہ انگریزی زبان میں

ہونے کی وجہ سے ان کی اشاعت اتنی زیادہ نہیں ہو سکتی۔ جتنی کہ ہندوستانی زبان میں ہونیکی صورت میں ہوگی۔ مگر چونکہ ان تمام اخباروں کی ہستی کی علت یہ ہے۔ کہ وہ رعایا کی شکایات حکام تک پہنچانے کے لیئے بنائے گئے ہیں۔ نہ کہ لوگوں میں بیداری پیدا کرنے کے لئے اس لئے ان کی زبان حکام کی زبان ہونی چاہیئے۔ کیونکہ ان کا روئے سخن حکام کی طرف ہے۔ مگر جب حکام کو مخاطب کرنیکی ضرورت کم رہ جائیگی اور ضروری معلوم ہوگا۔ کہ ایک دوسرے سے خطاب کیا جائے۔ تو اعلیٰ سے اعلیٰ اخبار اپنی زبان میں ہی ہوں گے۔

سیاسی ضروریات کے علاوہ تجارتی کاروبار کے لئے بھی انگریزی زبان کا سیکھنا ضروری ہو گیا تھا۔ ہندوستان کی تجارت زیادہ تر انگلستان کے ساتھ ہی ہے۔ اور تاجروں کے ساتھ خط وکتابت کے لئے تھوڑا بہت انگریزی کا جاننا بھی ضروری تھا۔ یہ وجہیں کافی تھیں۔ کہ ہندوستان میں ایک طبقہ انگریزی دانوں کا پیدا ہو جاتا مگر وہ وجہ جس کے باعث انگریزی تعلیم اس سرعت سے ہندوستان میں پھیل گئی۔ اور جس غرض کے لئے ہر ہندوستانی باپ اپنے بیٹے کو انگریزی تعلیم دینا ضروری سمجھتا ہے۔ اور ہے۔

۱۸۳۷ء میں ایک قانون پاس ہوا۔ جس کی رو سے کچہریوں کی زبان بجائے فارسی کے انگریزی مقرر ہوئی۔ ۱۸۴۴ء میں لارڈ ہارڈنگ نے اعلان کیا۔ کہ آئندہ تمام سرکاری ملازمتوں کے لئے انگریزی دانوں کو ترجیح دی جائے گی۔ اور انگریزی زبان میں ایک امتحانات کا سلسلہ مقرر کیا۔ جس کے ذریعہ سے امیدواروں کا انتخاب ہونے لگا[۵۴]۔ اس قانون کے بعد انگریزی تعلیم میں اصلی ترقی ہونی شروع ہوئی۔ جب پہلے انگریزی دانوں کو اچھی ملازمتیں

---

[۵۴] کلکتہ یونیورسٹی کمیشن رپورٹ جلد اوّل باب ۳ ص ۳۷

مل گئیں ۔ اور وہ ملک میں معزز شمار ہونے لگے۔ اور انگریزوں کے نزدیک بھی قابل قدر سمجھے گئے۔ تو اہل بنگال نے سب سے اوّل اور ان کی تقلید میں تمام شمالی ہندوستان نے اپنی ترقی کا بہترین ذریعہ یہ سمجھا کہ اپنے بچوں کو انگریزی سرکاری تعلیم دلا کر ملازمت میں داخل کیا جائے۔ چنانچہ آج تک بھی قریباً تمام انگریزی خوانوں کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے ۔ کہ وہ تعلیم پا کر کسی بڑے سرکاری عہدے پر مقرر ہو جائیں اور اگر اس سے رہ گئے ۔ تو وکالت کر لیں گے ۔ اور اگر وہ بھی نہ ہو سکا ۔ تو کلرکی یا معلمی اختیار کر لیں گے ۔ دس پندرہ برس پہلے ہندوستانیوں کا معراج اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری تھا جس کے مقابلے کے لئے تمام ہونہار لڑکے جن کو اپنی قابلیت پر وثوق ہوتا تھا کوشش کرتے تھے ۔ اور جن کو اپنے حافظے پر زیادہ اعتبار نہیں ہوتا تھا ۔ وہ وکالت کی طرف چلے جاتے تھے ۔ کچھ ڈاکٹری کی طرف جاتے تھے ۔ اور کچھ سول انجینرنگ کی طرف ۔ مگر ان سب میں خواہ ڈاکٹر بنیں ۔ یا سول انجینر ہر ایک کی کوشش یہی ہوتی ہے ۔ کہ سرکاری ملازمت مل جائے ۔ اب ایک دو برس سے ہندوستانیوں کا منتہائے نظر کچھ بلند ہو گیا ہے ۔ اب بجائے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کے اسسٹنٹ کمشنری اور بجائے جمعداری کے لفٹننٹی کے خواہشمند ہیں ۔ چند عہدے ہیں ۔ جو ایک کثیر تعداد امیدواروں میں سے صرف چند کو مل سکتے ہیں ۔ مگر سب کی نگاہیں ان پر لگی رہتی ہے ۔ اور سب ان کے لئے کوشش کرتے ہیں ۔ ایک دو کامیاب ہو جاتے ہیں ۔ اور باقی مایوس ہو کر ان سے کم درجہ کی سرکاری ملازمت کی طرف رخ کرتے ہیں ۔ اور جب اس سے بھی رہ جاتے ہیں ۔ تو اس سے کم درجہ کے لئے کوشش کرتے ہیں ۔ اور جب سب سے رہ جاتے ہیں ۔ تو پھر جو کام مل جائے ۔ اس کو چار و ناچار اختیار کر لیتے ہیں ۔ مگر زندگی کے آخری دم تک عقاب کی طرح ان کی پرازحرص نگاہیں کسی سرکاری ملازمت کے خالی ہونے

کی منتظر رہتی ہیں۔ اور کچھ تعجب نہیں۔ کہ مرنے کے بعد بھی انہیں سرکاری ملازمت کی خواہش باقی رہتی ہو۔

اُوپر جو بیان ہوا ہے۔ اس میں کچھ بھی مبالغہ نہیں۔ **عموماً** ہندوستان کے تعلیم یافتہ لوگوں میں سرکاری ملازمت کا خیال بہت قوی ہے۔ ہم انگریزی دان خوب جانتے ہیں۔ کہ ہم نے کن امیدوں سے انگریزی تعلیم حاصل کی تھی۔ ہمارے مشیر ہمیں کیا کہتے تھے۔ اور ہمارے والدین کی کیا آرزوئیں تھیں۔ اور ہمارے سامنے کن لوگوں کے نمونے پیش کیے جاتے تھے۔ اور اب زمانہ طالب علمی سے گذر کر ہم خوب جانتے ہیں۔ کہ ہمارے شاگردوں کے کیا ارادے ہیں۔ بہت کم ہیں وہ لوگ جو ابتدا ہی سے ان اغراض کو بالائے طاق رکھ کر محض علم کی خاطر انگریزی زبان کی تحصیل کرتے ہیں۔ ایسے لوگ ہندوستان میں بہت کم ہیں۔ اور ان کے نمونے میں وہ تاثیر نہیں۔ جو ان سرکاری عہدہ داروں اور کامیاب وکلا میں ہے۔ جنہوں نے حکومت میں اعزاز حاصل کیے ہیں۔ یا لاکھوں روپے جمع کیے ہیں۔ ہمارے ملک میں غالب نمونہ اسی قسم کے لوگوں کا ہے۔ اور انہی کی زندگیاں اکثر حصہ نوجوانوں کی عملی رہنما ہیں۔

۱۸۸۲ء کی تعلیمی کمیشن نے بنگال میں اندازہ لگایا۔ کہ ۱۸۵۷ء اور ۱۸۸۲ء کے درمیان ۱۵۸۹ طالب علموں نے کلکتہ یونیورسٹی سے بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں ان میں سے ۵۲۶ سرکاری ملازم ہوگئے۔ ۵۸۱ نے وکالت اختیار کی۔ ۱۲ ڈاکٹر بنے۔ اور جو ۴۷۰ بچے ان کا اکثر حصہ کالجوں اور سکولوں میں ملازم ہو گیا۔[۵۵] یہ تو چالیس برس پہلے کی بات تھی۔ مگر اب بھی بعینہ یہی روش ہے۔ اور یہ امر ایسا واضح اور ثابت شدہ ہے۔ کہ اعداد و شمار

---

[۵۵] کلکتہ یونیورسٹی کمیشن رپورٹ باب ۳ صـــ ۴۹۔

کی ضرورت ہی نہیں۔ اگر آج انگریزی تعلیم معاش کا ذریعہ نہ رہے تو طالب علموں کا سیلاب جو انگریزی سکولوں اور کالجوں کی طرف بہ رہا ہے۔ فوراً رک جائے۔ یہ رجحان ایسا قوی ہے۔ کہ جب مہاتما گاندھی نے لوگوں کو وکالت سرکاری ملازمت اور انگریزی مدرسوں میں تعلیم ترک کرنے کی تحریک کی۔ تو باوجود اس کے کہ مہاتما گاندھی ان طبقوں میں بے حد مقبول ہیں۔ اس قدر کم لوگوں نے تعلیم یا ملازمت یا وکالت چھوڑی۔ کہ ان کی تحریک کو بڑی ناکامی ہوئی۔ اس کی وجہ صاف ہے۔ ہندوستان میں بیدار اور تعلیم یافتہ طبقہ کے ذرائع معاش خالصتہً یہی چیزیں ملازمت سرکاری اور وکالت ہیں۔ اور ذرائع معاش کا ترک کرنا کسی ملک میں بھی کسی جماعت کے لیئے آسان نہیں۔ اگر یہ تحریک یورپ کے کسی ملک میں ہو۔ تو چونکہ سرکاری ملازمت اور وکالت ان ملکوں میں بہت کم لوگوں کا ذریعہ معاش ہے۔ اور وہاں بہت سے ایسے کام مل سکتے ہیں۔ جن میں یہ سب لوگ جذب ہو سکتے ہیں۔ تو ان لوگوں کے لیئے ان دونوں پیشوں سے دستبردار ہونا کچھ مشکل نہیں ہوگا۔ برخلاف اس کے ہندوستان میں ان پیشوں سے دست بردار ہونا بہت سے لوگوں کے لیئے فاقہ کشی کا موجب ہوگا

۱۰۵ برس ہو گئے ہیں۔ جب راجہ رام موہن رائے نے انگریزی تعلیم کے لیئے پہلا کالج قائم کیا۔ اس کے بعد سینکڑوں کالج اور ہزاروں سکول اسی غرض کے لیئے جاری ہو چکے ہیں۔ اور یہ خیال اب تک دلوں میں راسخ ہے۔ کہ انگریزی تعلیم حاصل کرکے سرکاری ملازمت اور وکالت ڈاکٹری سول انجینئرنگ وغیرہ بھی قومی ترقی کے ذریعے ہیں۔ اس خیال پر پچھلے برس ترک موالات کا عظیم الشان بھونچال آیا تھا۔ مگر جیسا کہ عام بھونچالوں میں ہوتا ہے۔ یہ خیال متزلزل ہو کر پھر اپنی جگہ پر قائم ہو گیا ہے۔

دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ اگر ہم اپنے بیان کی تصدیق میں سر

سید احمد خان صاحب کی تقریروں میں سے چند اقتباسات درج کریں جن سے وہ مقاصد واضح طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ جن کے لئے ہندوستانی انگریزی تعلیم کی طرف راغب ہوئے۔ ایسا ہی مولوی نذیر احمد صاحب کے لکچروں میں چند مقامات سے اس عظیم الشان تحریک کے وجود کا پتہ لگتا ہے۔ جس کے باعث اس قدر انگریزی خوان ملک میں نظر آتے ہیں۔ سر سید احمد خان ہندوستان میں مسلمانوں کے درمیان انگریزی تعلیم کے سب سے بڑے محرک تھے۔ اس لئے جو وجوہ انہوں نے قوم کو اس تعلیم کی طرف مائل کرنے کے لئے بیان کئے ہیں۔ وہی ملک کی بہترین آرزوؤں کا خلاصہ تھے۔ ان سے ہمیں صاف طور پر پتہ چلتا ہے۔ کہ اس وقت ملک میں بہتری اور ترقی کا منتہی کیا تھا۔ اور انگریزی علوم اس مقصد تک پہنچانے کے لئے کس طرح مفید ہو سکتے تھے۔

۱۸۶۴ء میں سر سید نے غازی پور میں انگریزی مدرسہ کی بنیاد رکھتے ہوئے ان الفاظ میں اپنے مدعا کا اظہار فرمایا: ؎۵۶

"اے ہندوستانی صاحبو تمہارا خیال جو اس ضلع میں مدرسہ جاری کرنے کا ہوا ہے۔ درحقیقت ایک نہایت عمدہ اور قابل نہایت تعریف کے خیال ہے۔ مجھ کو امید ہے۔ کہ تم اور ضلعوں کے لئے ایک روشنی ہو گے۔ اور اور ضلعوں کے لوگ بھی تمہارے دیکھا دیکھی ایک ایک مدرسہ اپنے ضلع میں قائم کریں گے۔ مجھ کو خوب معلوم ہے۔ کہ تم اس بات سے بخوبی واقف ہو۔ کہ ہندوستانیوں کے لئے علم میں ترقی کرنے کی کس قدر ضرورت ہے۔ تم کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ ہماری ملکہ معظمہ وکٹوریا دام سلطنتہا نے علانیہ فرمایا ہے۔ کہ میری ہندوستانی اور ولایتی رعایا دونوں برابر ہیں۔ اور یہ صرف کہنا

---

۵۶ دیکھو مجموعہ لکچرز سر سید مرتبہ مولوی امام الدین گجراتی ص ۱۹

ہی نہیں ہے۔ بلکہ ایسا کرنے کو موجود بھی ہے۔ تم میں سے کوئی کلکتہ گیا ہوگا۔ اس نے دیکھا ہوگا۔ کہ بابو چندر ناتھ تمہارا ہندوستانی ہم وطن ہائی کورٹ کا جج ہے۔ وہی اختیار اور اقتدار جو انگریزی ججوں کو ہیں۔ اس کو بھی حاصل ہیں۔ جو انگریزی جج تنخواہ پاتے ہیں۔ وہی تنخواہ وہ بھی پاتا ہے۔"

۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء میں جلسہ صدر انجمن اسلامیہ لاہور میں تقریر کرتے ہوئے سرسید نے فرمایا: "شمال مغربی اضلاع میں دو چار اور پنجاب میں دس پانچ مسلمان معزز عہدوں پر دکھائی دیتے ہیں اگر ہم لوگ اپنی قوم کی فکر نہ کریں گے۔ اور اس کی ترقی کے سامان بہم نہ پہنچائیں گے۔ اور جو لیاقتیں ایسے عہدوں کیلئے درکار ہیں۔ حاصل نہ کریں گے۔ تو ان چند عہدہ داروں کے بعد مسلمانوں کا خاتمہ بالخیر ہے۔ شاید دس بیس آدمی چپڑاسی پیادوں میں دکھائی دیں۔ ورنہ سب کی گھاس کھودنے کی نوبت آوے گی۔ اے صاحبان جبکہ ہماری قوم کا ایسا بدتر حال ہے۔ کیا ہم سب کا فرض نہیں ہے کہ جہاں تک ہو سکے۔ اپنی قوم کے سنبھالنے میں کوشش کریں"۔ ۵۷

۱۸۹۷ء کی ایجوکیشنل کانفرنس میں جو شاہجہانپور میں منعقد ہوئی۔ سرسید نے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی تحریص دلاتے ہوئے بیان فرمایا: "اب خدا کی مرضی سے انگلش گورنمنٹ ہم پر حکمران ہے۔ جو امن وامان اور مذہبی آزادی سے ہم پر حکومت کرتی ہے اب انگریزی زبان کا عروج ہے۔ تمام علوم وفنون انگریزی زبان میں ہیں۔ جو کچھ ہمارے بزرگوں کے پاس عربی زبان میں تھا۔ اس سے بہت زیادہ اب انگریزی میں ہے۔ درباری زبان انگریزی ہے ہماری زندگی کے تمام کاروبار میں انگریزی زبان نے سرایت کی ہے

---

۵۷ ایضاً ص ۱۰۱

بغیر انگریزی دانی کے ہم رستہ پر بھی نہیں چل سکتے۔ اگر ریل پر سوار ہونے کو جائیں۔ تو نہیں جانتے۔ کہ کس وقت جائیں۔ کس رستہ سے جائیں۔ اور کہاں سے ٹکٹ لیں۔ اور کس رستہ سے نکلیں۔ پس اگر اس زمانہ میں دنیا میں رہنا ہے۔ اور عزت سے زندگی بسر کرنی ہے۔ تو ہمارا فرض ہے۔ کہ ہم اپنی اولاد کو انگریزی علوم کی تعلیم دینا اور اسی کے ساتھ عقائد مذہبی سے بھی ان کو جاہل اور بے بہرہ نہ رکھیں۔

"اے عزیزو یہ بات ظاہر ہے۔ کہ سرکاری معزز عہدوں میں انگریزی دانی کی قید لگ گئی ہے۔ جو بغیر انگریزی دانی کے حاصل نہیں ہو سکتے۔ اور روز بروز ہر ایک نوکری میں یہ قید لگتی جاویگی۔ مگر مَیں جو اپنی قوم کو انگریزی پڑھنے کی رغبت دلاتا ہوں۔ اس سے صرف سرکاری نوکریاں حاصل کرنا میرا مدعا نہیں ہے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ اور ہر ایک طالبعلم جو انگریزی پڑھتا ہے۔ بخوبی جانتا ہے۔ کہ گورنمنٹ میں اس قدر نوکریاں نہیں ہیں۔ جو انگریزی خوانوں کو گو انہوں نے کتنا ہی کمال انگریزی میں حاصل کر لیا ہو مل سکیں ہاں انگریزی تعلیم پائے ہوؤں کو نوکریاں بھی ایک ذریعہ حصول معاش کا ہے۔ مگر جن کو اس بات کا یقین ہے۔ کہ اس زمانہ میں ہماری زندگی کے تمام کاروبار تجارت اور کیا حرفت اور کیا کسی قسم کے پیشے سب انگریزی دانی پر منحصر ہو گئے ہیں۔ اور جب تک ہم انگریزی میں کامل استعداد پیدا نہ کریں۔ دنیا میں کسی لائق نہیں ہو سکتے۔ وہی سیدھے راستے پر ہیں۔ اور انہیں کا خیال بہت صحیح ہے۔"[۵۸]

یہ تقریر سرسیّد کی وفات سے کچھ ہی مدت پہلے کی ہے۔ ایک

---

۵۸ ایضاً ص ۴۷۵

تو وہ ابتدائی زمانہ تھا۔ جب سرکاری ملازمتیں زیادہ تھیں۔ اور قابل آدمی کم تھے۔ اب پچاس پچپن برس کی کوشش سے اتنے انگریزی دان پیدا ہو گئے تھے۔ کہ سرکاری ملازمتیں کم تھیں۔ اور امیدوار زیادہ۔ اسی کی طرف سرسید نے اپنے آخری الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔ کہ انگریزی کو تمام کاروبار میں مفید سمجھ کر پڑھو۔ اور صرف سرکاری نوکری کا خیال نہ کرو۔

سرسید تو خود محرک تھے۔ اور ان کا کام یہ تھا۔ کہ مسلمانوں کی رہنمائی کریں۔ اور ان کے لئے نئے راستے پیدا کریں۔ اب ہم مولوی نذیر احمد صاحب کی شہادت درج کرتے ہیں۔ جو ایک تماشائی کی حیثیت سے زمانے کی روش کو دیکھنے تھے۔ مولوی صاحب نے دسمبر ۱۸۸۸ء کے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسہ میں جو لاہور میں منعقد ہوا لکچر دیا۔ جس میں آپ نے یہ کہا: "ازبس کہ ہر سال مکتبوں اور طالبعلموں کا شمار زیادہ ہوتا جاتا تھا۔ گورنمنٹ جانتی تھی۔ کہ لوگ پبلک انسٹرکشن کی قدر کرتے جاتے ہیں۔ ایک مدت دراز تک گورنمنٹ کو بھی خیال رہا۔ یہاں تک کہ نوکری کے لئے مڈل کے امتحان کی قید لگا دی گئی۔ اس وقت سے البتہ لوگ سرکاری تعلیم کی طرف راغب ہوئے۔ لیکن نہ اس وجہ سے کہ اس تعلیم کو پسند کرتے ہیں۔ بلکہ صرف نوکری کی طمع سے۔ تو میں نے راغب ہوئے غلط کہا۔ مجھ کو کہنا چاہیئے تھا۔ کہ مجبور ہوئے۔ پھر یہی تماشہ وکالت اور مختاری کے امتحانوں میں دیکھا۔ ان باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ لوگ معاش کی طرف سے مضطر ہیں۔ جدھر توقع پاتے ہیں۔ بے تامل دوڑے چلے جاتے ہیں"۔ ۵۹

---

۵۹ ڈاکٹر مولوی حافظ نذیر احمد صاحب ایل ایل ڈی کے لکچروں کا مجموعہ مرتبہ مولوی بشیر الدین احمد صاحب حصہ اول ص ۵۹

اب ہمیں دوسرے سوال کا جواب دینا ہے۔ کہ پادریوں اور گورنمنٹ انگریزی نے انگریزی علوم کے سکھانے میں کیا مصالح سمجھے۔ پادری صاحبان کی غرض اس وقت اور اب بھی ہندوستان کے لوگوں کو مذہب عیسائیت کی طرف لانا ہے۔ اور اس کے لئے بہترین طریقہ یہی ہوسکتا تھا۔ کہ لوگوں کو ایسے علوم پہلے سکھائے جائیں۔ جن کو سیکھ کر حق و باطل میں تمیز آسان ہو جائے۔ اور اگر عیسائی نہ ہوں۔ تو کم از کم اس قابل ہو جائیں۔ کہ عیسائیت کی خوبیوں کو سمجھ سکیں۔ چنانچہ ہر مشن کالج اور سکول میں انجیل کی تعلیم کے لئے ایک گھنٹہ مقرر ہے۔ جس میں تمام طلباء کو خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں۔ حاضر ہونا پڑتا ہے۔ مگر پادری صاحبان کی یہ غرض بہت حد تک پوری نہ ہو سکی۔ اس میں شک نہیں۔ کہ مغربی علوم کو مشرقی علوم پر وہی فوقیت حاصل تھی۔ جو مغربی سلطنتوں کو مشرقی سلطنتوں پر ہے۔ اور ان علوم کا اثر ہونا لازم تھا۔ چنانچہ جس حقارت سے انگریز عالم ہندوستانی عالموں کو دیکھتے تھے۔ اس سے بڑھ کر وہ حقارت تھی۔ جس سے ایک ہندوستانی انگریزی دان ایک فارسی دان کو دیکھنے لگا۔ مغربی علوم کی فوقیت کو تو لوگوں نے تسلیم کر لیا۔ مگر جس غرض کے لئے پادری صاحبان نے ان علوم کے مدارس کھولے تھے۔ یعنی یہ کہ مذہب عیسائیت کی فوقیت ثابت ہو۔ وہ کام نہ ہو سکا۔ اگر دو ہزار برس کی مؤانست کی وجہ سے اہل یورپ کو الوہیت مسیح و تثلیث توہمات نہیں معلوم ہوتے تھے۔ تو چار ہزار برس کی مؤانست کے بعد اہل ہند اپنے قدیمی مذہب کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اگر ہندوؤں میں توہم پرستی تھی۔ تو عیسائیوں میں بھی موجود تھی۔ ایک سلسلہ اوہام کو چھوڑ کر دوسرے سلسلہ میں جانے کے لئے قوی وجوہات چاہئیں۔ مسلمانوں کی مذہبی حالت ہندوؤں سے قوی تھی۔ اسلام عقلی لحاظ سے عیسائیت سے بالاتر تھا۔ اور اگر یورپ

کے فلسفیوں کو ایک نیا مذہب بنانے کی ضرورت ہو۔ تو غالباً عیسائیت کی نسبت اسلام سے بہت زیادہ اعتقادات انہیں اپنے مفید مطلب مل جائیں گے۔ اسلام کے نزدیک عیسائیت توہم پرستی تھی۔ اور تین خداؤں کا مسئلہ ایک خدا کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ اس لئے عیسائیوں نے مسلمان بزرگوں اور پیغمبروں کے چال چلن پر حرف گیری کرنے کا طریق اختیار کیا۔ اس کا جواب عیسائی بزرگوں کے چال چلن پر حرف گیری تھی۔ اور وہ دیا گیا۔ اور پادری صاحبان اس طریق سے بھی مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں کامیاب نہ ہوئے غالباً پادری صاحبان کی آرزوئیں اور توقعات یہ تھیں۔ کہ جیسے پولوس اور اس کے شاگردوں نے یورپ کو عیسائی بنا لیا تھا۔ یا جیسے مسلمانوں نے تمام مفتوحہ ممالک کو مسلمان بنا لیا تھا۔ ایسے ہی وہ بھی ہندوستان کو عیسائی بنا لیں گے۔ اور جب ہندوستان عیسائی ہو جائیگا۔ تو وہ انگلستان کا ایسا ہی خیر خواہ ہوگا۔ جیسا کہ اسلامی ممالک عرب کے خیر خواہ ہیں۔

اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ عیسائیت شاہی مذہب تھا۔ اور شاہی قوم کی ہر ادا محبوب ہوتی ہے۔ لوگوں کو اس کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے تھا۔ اور متوجہ ہوئے بھی مگر یہی علوم جن کے ذریعہ سے پادری صاحبان کو عیسائیت کی طرف مائل کرنا چاہتے تھے۔ وہی عیسائیت کے قاتل ثابت ہوئے۔ جس زمانے میں پادری صاحبان نے ہندوستان میں مدارس جاری کرنے شروع کئے ہیں۔ اسی زمانے میں یورپ کے فلسفیوں سائینس دانوں اور مورخوں نے عیسائیت کی عمارت پر ہر پہلو سے حملے کرنے شروع کر دئے تھے۔ اور وہ سب کتابیں ان طالبعلموں کے ہاتھ میں آئیں۔ جن کو پادری صاحبان عیسائیت کے لئے تیار کر رہے تھے۔

اس سے بھی بڑھکر ایک اور رنگ پیدا ہو گیا۔ جسنے ہندوستانکے لوگوں کو

عیسائیت سے قطعاً متنفر کر دیا۔ بہت سے لوگ کسی مذہب کو اسکی اعتقادی خوبی کیوجہ سے اختیار نہیں کرتے بلکہ اس مذہب کے لوگوں کی مجلس میں شامل ہونیکے لئے اختیار کر لیتے ہیں فاتح قوم کے مذہب میں داخل ہونے کے لئے قوی تر وجہ فاتحین کے قرب کا حصول ہے۔ ابتدا میں مفتوحین ہر طرح سے کوشش کرتے ہیں۔ کہ ان کو فاتحین کے قریب جانے کا موقعہ ملے۔ وہ ان سے ملیں۔ ان کے ساتھ بات چیت کریں۔ ان کے ساتھ راہ و رسم پیدا کریں۔ ان کے برابر بیٹھنے کا موقعہ ملے اور آخر میں انہی میں جذب ہو جائیں۔ یہ میلان ہندوستان کے لوگوں میں بھی تھا۔ اور اگر وہ لوگ جو ابتدا میں عیسائی ہوئے تھے۔ انگریزی سوسائٹی میں شامل کر لئے جاتے۔ اور انگریز ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے۔ جیسا دوسرے انگریزوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ تو ہندوستان میں سے ایک بہت بڑی تعداد عیسائی ہو جاتی۔ اور وہ انگریزوں کے ایسے ہی خیر خواہ ہوتے۔ جیسے ہندوستانی مسلمان اہل عرب کے ہیں۔ مگر جب ہندوستانیوں نے دیکھا۔ کہ جو لوگ عیسائی ہوئے ہیں۔ انگریز ان کو بھی اپنے سے ایسا ہی دور رکھتے ہیں۔ جیسا غیر عیسائیوں کو۔ تو اپنا قدیمی مذہب چھوڑنے کی یہ وجہ بھی نہ رہی۔ بات یہ تھی کہ انگریزوں کو اپنی نسلی فوقیت کا احساس مذہبی احساس سے بہت بڑھ چڑھ کر تھا۔ مغربی لوگ عموماً اپنے آپ کو مشرقی لوگوں کی نسبت بہت زیادہ مہذب سمجھتے ہیں۔ اور ہندوستان میں آکر دیسی لوگوں سے ایسا پرہیز کرتے ہیں۔ جیسا کہ ایک برہمن چھوٹی ذات والے سے کرتا ہے۔ برخلاف اس کے اسلام کی ترقی کی وجہ یہ تھی۔ کہ مسلمان جہاں بھی فاتح ہو کر گئے۔ انہوں نے مفتوحین کے ساتھ نسلی امتیاز نہیں کیا۔ اگر ایک چمار بھی مسلمان ہوا۔ تو وہ دوسرے مسلمانوں میں فوراً جذب ہو جاتا تھا۔ خلاصہ یہ ہے۔ کہ پادری ہندوستانیوں

کو عیسائی بنانے میں بہت کم کامیاب ہوئے۔ اور اتنی تعداد بھی نہ پیدا کر سکے۔ جو سیاسی امور میں کچھ بھی اہمیت رکھتی ہو۔ مگر ہندوستانیوں کو اس ذریعہ سے مغربی علوم سے مستفید ہونے کا موقعہ مل گیا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے اکثر علاقوں میں مغربی تعلیم سب سے پہلے مشن سکولوں کے ذریعہ ہی سے آئی۔

اب اس سوال کا دوسرا حصہ ہمارے سامنے ہے۔ وہ یہ کہ گورنمنٹ انگریزی کی کیا مصلحت تھی۔ جس کی وجہ سے اس نے انگریزی علوم کو رواج دیا۔ سب سے پہلی وجہ گورنمنٹ کی اپنی ضرورت تھی۔ ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے ضروری تھا۔ کہ حکومت کے عامل رعایا تک اپنے احکام پہنچا سکیں۔ اور رعایا کے خیالات کو سمجھ سکیں۔ اس کے لئے یا تو چاہئے تھا۔ کہ انگریزی عمال ہندوستانی زبانوں میں ایسی مہارت پیدا کرتے۔ کہ ان زبانوں میں بے تکلف تحریر و تقریر کر سکتے۔ اور یا ہندوستانیوں کی ایک کثیر تعداد انگریزی زبان سیکھ جاتی۔ قاعدے کی بات ہے۔ کہ مغلوب کو غالب تک پہنچنے کا شوق غالب کے شوق سے جو اس کے دل میں مغلوب کی بہتری کے لئے پیدا ہو سکتا ہے۔ زیادہ قوی ہوتا ہے۔ سو اگرچہ اجنبی ہونے کی حیثیت سے انگریزوں کو اس ملک کی زبانیں پہلے سیکھنی پڑیں۔ مگر آخر میں باہمی تبادلہ خیال کے لئے جو زبان زیادہ کارآمد ثابت ہوئی۔ وہ انگریزی ہی تھی۔ انگریزوں کا خیال ہے۔ کہ وہ غیر زبانیں ایسی اچھی طرح نہیں سیکھ سکتے۔ جیسے کہ ہندوستانی مگر اصل میں ہندوستانیوں کی فضیلت کوئی جبلی فضیلت نہیں ہے بلکہ حاجتمندی و شوق کا سوال ہے۔ جس شخص کو احتیاج یا شوق زیادہ ہوگا۔ وہ اپنے دماغ کو زیادہ متوجہ کرے گا۔ اور اپنی استعداد کے مطابق جلدی سیکھ لیگا۔ ایک ملک میں تمام عمر گذار کر اس زبان کے چند فقرے بھی صحیح طور پر نہ بول سکنا کمی استعداد کی وجہ سے

نہیں۔ بلکہ بے پرواہی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے انگریز افسروں نے ایسے ہندوستانیوں کے وجود کو غنیمت سمجھا۔ جو ان کے احکام کو رعایا تک پہنچا سکیں۔ اور رعایا اور ان کے درمیان ترجمان کا کام کر سکیں۔ آہستہ آہستہ ترجمانی کی قدر ہندوستانیوں کو بھی معلوم ہونے لگی۔ اور ان میں سے زیادہ زیادہ تعداد میں لوگ اس پیشہ کو اختیار کرنے لگے۔ ہندوستان میں تو ایک ذریعہ معاش بن گیا۔ اور اس لئے والدین نے چھوٹی عمر سے اپنے بچوں کو انگریزی زبان سکھانی شروع کر دی۔ تاکہ یہ آسانی سے سیکھ لیں۔ مگر انگلستان کے لوگوں کے لئے ضروری نہیں تھا۔ کہ وہ بچپن سے ہندوستانی زبانیں سیکھنے کی طرف توجہ کرتے۔ اپنی مروجہ تعلیم لاطینی اور انگریزی زبانوں میں حاصل کرکے ان میں سے جو اس ملک میں آنا پسند کرتے ہیں۔ وہ یہاں آکر ہندوستانی انگریزی دانوں سے اپنی ضرورت کے مطابق تھوڑی سی ہندوستانی زبان سیکھ لیتے ہیں۔ مگر ہندوستانی زبانوں کا سیکھنا ان کے لئے ایسا نامرغوب اور بڑی عمر ہونے کی وجہ سے کچھ ایسا مشکل ہے۔ کہ علاوہ احکام جاری کرنے کے گورنمنٹ کو بڑے بڑے انعام بھی دینے پڑتے ہیں۔ جن کی مقدار اس خرچ سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ جو ان کو امتحانوں کی تیاری کے لئے کرنا پڑتا ہے۔

اس کے علاوہ دوسری مشکل اور تھی۔ اور وہ ہندوستان میں ایک زبان کا نہ ہونا تھا۔ اگر تمام ہندوستان کی ایک زبان ہوتی۔ تو انگریز افسروں کے لئے رعایا کے ساتھ ان کی اپنی زبان میں گفتگو کرنا اتنا مشکل نہ ہوتا جتنا اب ہے۔ ہر علاقے میں جا کر اس علاقے کی زبان کا حاصل کرنا عمر رسیدہ اور مصروف کار حکام کے لئے ایک محال امر تھا۔ اس لئے ہر علاقے میں ایسے ہندوستانیوں کی حوصلہ افزائی کرنی پڑی۔ جنہوں نے انگریزی زبان میں مہارت پیدا کی تھی

ان سے بھی بڑھ کر ایک اور وجہ پیدا ہو گئی تھی۔ جس کے باعث گورنمنٹ مجبور تھی۔ کہ انگریزی زبان کے تعلیم یافتہ لوگوں کی قدر کرے اور اس طرح سے انگریزی تعلیم کا لوگوں کو شوق دلائے۔ گورنمنٹ انگریزی کو ملک پر اقتدار قائم رکھنے کے لئے ضرورت تھی۔ کہ ملک میں ریلیں اور سڑکیں ہوں۔ تاکہ فوج بوقت ضرورت ایک جگہ سے دوسری جگہ آسانی سے جا سکے۔ ایسے ہی خبر رسانی کے لئے تار کی ضرورت تھی۔ تاکہ ملک کے ہر حصّہ کی خبر حکومت کے مرکز میں جلدی پہنچ جائے۔ اور حکومت سرعت سے تمام علاقوں میں اپنے احکام جاری کر سکے۔ ایسے ہی ہندوستان کی حکومت سے تجارتی اور مالی منفعت اسی صورت میں ہو سکتی تھی۔ جب ہندوستان کی پیداوار آسانی سے اور تھوڑے خرچ پر بندرگاہوں پر پہنچ سکے۔ تاکہ وہاں سے جہازوں میں لاد کر یورپ کو لے جائی جا سکے۔ اگر ہندوستان میں ریلیں نہ ہوتیں۔ تو یورپ کے ساتھ اس قدر وسیع تجارت کبھی قائم نہ ہو سکتی۔ اسی طرح گورنمنٹ کو سپاہیوں کے علاج کے لئے ایسے لوگوں کی ضرورت تھی۔ جو یورپین ڈاکٹروں کے طریق علاج سے واقف ہوں۔ اور انگریزی دوائیں تیار کر سکیں۔ ایسے ہی سلطنت کے حسابات کو باقاعدہ رکھنے کے لئے انگریزی طریق حساب جاننے والے کلرکوں کی ضرورت تھی۔ ان تمام انتظامات ملکی و فوجی کے لئے گورنمنٹ انگریزی کو ایک کثیر تعداد ایسے آدمیوں کی ضرورت تھی۔ جو بڑے انگریز افسروں کے ماتحت تمام چھوٹے منصبوں کو انگریزی زبان میں اور انگریزی طریق پر پورا کر سکیں۔ ریل اور سڑکیں بنانے کیلئے ایسے لوگوں کی ضرورت تھی۔ جو نقشہ انگریزی طریق پر تیار کر سکیں ملک کی پیمائش انگریزی آلات سے کر سکیں۔ جب ریلیں بن گئیں۔ تو تار بابوؤں سٹیشن ماسٹروں اور کلرکوں کی ضرورت تھی۔ فوج کے

لئے ڈاکٹروں کی ضرورت تھی۔ حسابات کے لئے انگریزی دان محاسبوں کی ضرورت تھی۔ اگر انگریزی حکومت کے ماتحت کوئی کام دیسی زبانوں میں چل سکتا تھا۔ تو وہ عدالتوں مالیہ اکٹھا کرنے یا پولیس کا کام تھا۔ باقی کام جن کے بغیر انگریزی حکومت کو استحکام حاصل نہیں ہو سکتا تھا اور جن کے بغیر وہ دیسی راجاؤں اور نوابوں سے بہت زیادہ طاقتور نہیں ہو سکتے تھے۔ بغیر ایک کثیر تعداد کے انگریزی دانوں کے نہیں چل سکتے تھے۔ اگر ان کاموں کے لئے انگلستان سے آدمی لائے جاتے۔ تو اول تو اتنی کثیر تعداد میں وہاں ایسے کاموں کے آدمی مل ہی نہ سکتے۔ اور جو چند ملتے۔ وہ یہاں آنے کے لئے اتنی بڑی بڑی تنخواہیں طلب کرتے۔ کہ ایسے آدمیوں کو رکھ کر ہر کام میں اتنا مالی نقصان ہوتا۔ کہ کوئی کام بھی نہ چل سکتا۔ اس لئے مجبوراً گورنمنٹ کو یہ طریق اختیار کرنا پڑا۔ کہ انگریز افسر صرف نگرانی اور رہنمائی کے لئے مہیا کئے جائیں۔ اور باقی سب کاموں کے لئے ہندوستانیوں کو ملازم رکھا جائے۔ ایسے ہندوستانی کلرک۔ اوورسیر۔ اسٹیشن ماسٹر۔ تار بابو۔ اکونٹنٹ۔ اور ڈاکٹر انگریزوں کے مقابلے میں نہایت قلیل تنخواہ پر خاطر خواہ کام کر رہے ہیں انگریزوں کو ایسے سستے آدمی اپنے ملک میں نہیں مل سکتے تھے۔ اور ہندوستانیوں کے لئے اتنی تنخواہیں ایک نعمت غیر مترقبہ تھیں۔ اس لئے تمام ملک نے ان کاموں کے لئے انگریزی تعلیم کیطرف رخ کیا۔ اور قبل اسکے کہ انگریزی گورنمنٹ انگریزی تعلیم دینے کا فیصلہ کرے۔ انگریزی تعلیم ملک میں جاری ہو چکی تھی۔ اور لوگ پرانے علوم کو چھوڑ چھوڑ کر انگریزی زبان اور علوم کو حاصل کر رہے تھے اگر انگریزی گورنمنٹ اس تعلیم کو روکنا بھی چاہتی تو جبتک گورنمنٹ کو ایسے ملازمین کی ضرورت تھی یہ تعلیم رک نہ سکتی۔ یہ تو وہ وجوہ ہیں۔ جو ہم نے تحقیقی مشاہدے سے قائم کی ہیں۔ اور جن کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ گورنمنٹ کو اپنے استحکام کے لئے ایسے ہندوستانیوں کی ضرورت تھی۔ جو انگریزی

جانتے ہوں۔ اور انگریز افسروں کے ماتحت سلطنت کے کارخانہ کو انگریزی طریق پر تمام ایشیائی طریقوں سے محکم تھا چلا سکیں۔ اب ہم دو شہادتوں کا امتحان کریں گے۔ جن میں خود انگریز حکام کی قلم سے بیان کیا گیا ہے۔ کہ کیوں ہندوستانیوں کو انگریزی تعلیم دینی چاہئے ان میں سے پہلی شہادت لارڈ میکالے کی ہے۔ جو تحریر اس نے ۱۸۳۵ء میں بحیثیت سررشتہ تعلیم کی کمیٹی کے پریزیڈنٹ کے لکھی۔ اور دوسرے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کا مراسلہ ہے۔ جو انہوں نے ۱۹ر جولائی ۱۸۵۴ء میں ہندوستان کی تعلیمی پالیسی کے متعلق ہندوستان کے گورنر جنرل کو بھیجا۔

لارڈ میکالے کی تحریر میں چار وجہیں پائی جاتیں ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے۔ کہ حقیقت میں بھی وجوہ اس کے دل میں تھیں۔ جب اس نے گورنمنٹ کو توجہ دلائی۔ کہ ہندوستانیوں کو انگریزی زبان میں تعلیم دلائی جائے۔ یا کوئی ان سے قوی تر وجہ بھی تھی۔ جس کا اس نے اظہار نہیں کیا۔ پہلی وجہ جس پر میکالے نے بہت زور دیا ہے۔ یہ ہے کہ گورنمنٹ نے ایک لاکھ روپے کی رقم ہندوستانیوں کی علمی ترقی کے لئے مقرر کی ہے۔ پس دیکھنا چاہئے۔ کہ اس وقت دنیا میں بہترین تعلیم کن علوم کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے۔ میکالے کی رائے ہے۔ کہ وہ علوم مغربی علوم ہیں۔ اور وہ زبان جس کے توسط سے یہ علوم سکھائے جا سکتے ہیں۔ انگریزی زبان ہے۔ اس لئے انگریزی زبان کی تعلیم دینی چاہئے۔ میکالے کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔ :" اب ہمارے سامنے سوال صرف یہ ہے۔ کہ جب ہمارے اختیار میں ہے۔ کہ ہم انگریزی زبان کی تعلیم دیں۔ تو کیا ہمیں ان زبانوں کی تعلیم دینی چاہئے۔ جن میں سب تسلیم کرتے ہیں۔ کہ کسی علم کی ایسی کتابیں نہیں ہیں جیسی کہ ہماری زبان میں۔ آیا جب ہم یورپین سائنس کی تعلیم دے سکتے ہیں

تو ہم کو ایسے علوم سکھانے چاہئیں۔ جن کا جہاں کہیں یورپین علوم سے اختلاف ہوتا ہے۔ تو وہ اپنے نقص کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور آیا جب ہم محکم فلسفہ اور صحیح تاریخ کی سرپرستی کر سکتے ہیں۔ تو کیا ہم پبلک کا روپیہ خرچ کر کے ایسے علم طب کی حمایت کریں جو ایک انگریز نعل بند کے لئے بھی موجب ذلت ہے۔ ایسا نجوم جس پر ایک انگریزی بورڈنگ سکول کی لڑکیاں بھی ہنسیں۔ ایسی تاریخ جو تیس فٹ لمبے تیس ہزار برس راج کرنے والے بادشاہوں سے بھری پڑی ہے۔ ایسا جغرافیہ جس میں شیرے اور مکھن کے سمندروں کا ذکر ہے۔ ہماری رہنمائی کے لئے تجربہ بھی موجود ہے۔ اس قسم کے حالات تاریخ میں بہت ہیں۔ اور ان سب سے ایک ہی سبق حاصل ہوتا ہے۔ اگر دور نہ جائیں۔ تو زمانہ حال ہی میں دو مثالیں موجود ہیں۔ جن میں ایک پوری جماعت کے دل میں تموج پیدا کر دیا گیا ہے۔ تعصبات کو دور کر دیا گیا ہے۔ علم پھیلایا گیا ہے۔ مذاق سلیم بنایا گیا ہے۔ علوم و فنون ایسے ملکوں میں قائم کر دئے گئے ہیں جو کچھ عرصہ پہلے جاہل اور وحشی تھے۔ پہلی مثال جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ مغربی اقوام میں پندرھویں صدی کے آخر میں اور سولھویں صدی کے ابتدا میں علوم کا احیاء ہے۔ اس وقت اگر کوئی چیز پڑھنے کے لائق تھی۔ تو وہ قدیم یونانیوں اور رومیوں کی تحریریں تھیں ..... دوسری مثال ابھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ گذشتہ ایک سو بیس برس کے عرصے میں ایک قوم جو ایسی وحشیانہ حالت میں تھی۔ جیسے ہمارے بزرگ صلیبی جنگوں سے قبل تھے۔ اب قعر جہالت سے نکل کر مہذب قوموں میں شامل ہو گئی ہے۔ میرا اشارہ ملک روس کی طرف ہے۔ اب اس ملک میں تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک بڑا گروہ ہے۔ جو حکومت کے اعلیٰ سے اعلیٰ مناصب پر کام کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔

اور کسی رنگ میں بھی پیرس اور لنڈن کے بہترین حلقوں کے قابل ترین لوگوں سے کم نہیں ۔ ...... مغربی یورپ کی زبانوں نے روس کو مہذب بنا دیا ہے ۔ مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں ۔ کہ ہنود پر بھی اس کا ایسا ہی اثر ہوگا ۔ جیسا کہ تاتاریوں پر ہؤا ہے ؟ نوٹ۱
میکالے کی نیک نیتی قابل تحسین ہے ۔ اس کے الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے ۔ کہ وہ چاہتا تھا ۔ کہ ہندوستانی بھی ایسے ہی بیدار مغز اور روشن دماغ ہو جائیں ۔ جیسے کہ یورپین ہیں ۔ دوسری وجہ جو میکالے نے بیان کی ہے ۔ یہ ہے ۔ کہ ہندوستان کے لوگ خود انگریزی تعلیم کی طرف مائل ہیں ۔ اور اپنے پرانے علوم کو چھوڑ رہے ہیں ۔ اور نہیں چاہتے ۔ کہ اپنا وقت پرانی کتابوں پر خرچ کریں ۔ اس لئے تعلیم اگر لوگوں کی خواہش کے مطابق ہونی ضروری ہے ۔ تو انگریزی زبان میں ہونی چاہیئے ۔ چنانچہ اسی تحریر میں جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے ۔ میکالے لکھتا ہے " ہندوستان میں حکمران قوم کی زبان انگریزی ہے ۔ گورنمنٹ کے دارالسلطنتوں میں ہندوستانیوں کے طبقہ اعلیٰ میں انگریزی زبان بولی جاتی ہے ۔ قرین قیاس ہے ۔ کہ مشرقی سمندروں میں جلدی یہ تجارتی زبان ہو جائے گی ۔ دو اٹھتی ہوئی یورپین قوموں یعنی اہل آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ کی یہ زبان ہے " دوسری جگہ لکھا ہے " قطعی شہادت سے یہ ثابت ہے ۔ کہ اس وقت ہم تعلیم کے معاملہ میں ہندوستانیوں کی مرضی کے مطابق کام نہیں کر رہے ہیں ۔ یہ بڑا ہوتا ۔ اگر ہم ان کی عقلی ترقی کو نقصان پہنچا کر ان کے عقلی رجحان کا تتبع کرتے ۔ مگر ہم دونوں میں سے ایک کا لحاظ بھی نہیں کر رہے ہیں ۔ ہم ان سے اس علم کو روک رہے ہیں جس کو وہ طلب کرتے ہیں ۔ اور ان کو ان جھوٹے علوم کے سیکھنے

نوٹ۱ دیکھو میکالے کی تحریر مندرجہ کلکتہ یونیورسٹی کمیشن رپورٹ جلد ۶ ضمیمہ ع۲

پر مجبور کر رہے ہیں۔ جن سے ان کو نفرت ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہمیں عربی اور سنسکرت کے طالبعلموں کو وظائف دینے پڑتے ہیں۔ مگر جو انگریزی پڑھتے ہیں۔ وہ ہمیں فیس دینے کے لئے تیار ہیں۔ ایک منصف مزاج شخص کے نزدیک تمام دعووں سے جو اس بارے میں کئے جائیں۔ کہ دیسیوں کے دل میں اپنی مقدس زبانوں کی محبت واحترام ہے۔ اس امر واقعہ کی زیادہ وقعت ہوگی کہ ہمیں اس وسیع سلطنت میں کوئی ایسا شخص نہیں ملتا۔ جو اپنی مقدس زبانیں جب تک کہ ہم اس کو وظیفہ نہ دیں۔ سیکھے اگر اس وقت میرے سامنے مدرسہ کے ایک ماہ یعنی دسمبر ۱۸۳۳ء کے حساب کے کاغذات ہیں۔ عربی کے طالبعلموں کی تعداد ۷۷ ہے سب کے سب وظیفہ خوار ہیں۔ ان پر پانچ سو روپیہ ماہوار کی کل رقم خرچ ہوتی ہے۔ اس کے مقابل میں ۱۰۳ روپے کی رقم درج ہے۔ جو مئی جون اور جولائی کے مہینوں میں انگریزی پڑھنے والے بیرونی طالبعلموں سے وصول کی گئی ہے۔ ...... اگر اور شہادت کی ضرورت ہو۔ تو وہ بھی موجود ہے۔ سنسکرت کالج کے پرانے طالبعلموں کی طرف سے ایک درخواست کمیٹی کے سامنے پیش ہوئی درخواست کنندگان نے بیان کیا۔ کہ انہوں نے دس یا بارہ برس کالج میں تعلیم پائی۔ اور وہ ہندی علم ادب اور طبیعات سے پورے واقف ہیں۔ اور انہوں نے فضیلت کی سندات حاصل کی ہیں۔

مگر اس کا نتیجہ کیا ہے۔ باوجود ان سندوں کے وہ کہتے ہیں۔ کہ ہمارے ہم وطن ایسی بے رخی سے ہماری طرف دیکھتے ہیں۔ کہ ان سے کسی ہمت افزائی اور امداد کی توقع نہیں۔ اور بغیر کمیٹی کی امداد کے اپنی حالت کے بہتر کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔ اس لئے وہ درخواست کرتے ہیں۔ کہ گورنر جنرل کے پاس

ان کی سفارش کی جائے۔ تاکہ انہیں ملازمت عطا کی جائے۔ جس سے وہ فقط اپنی زیست قائم رکھنے کے قابل ہو جائیں۔ .... وہ اپنی عرضی کو ان الفاظ سے ختم کرتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے۔ کہ جس گورنمنٹ نے ہمارے ساتھ زمانہ طالب علمی میں اس فیاضی کے ساتھ سلوک کیا ہے۔ اس گورنمنٹ کی کبھی یہ نیت نہ ہو گی۔ کہ ہمیں محتاجی اور کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ دے۔ .... ایک اور امر ہے جس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ جب دیسیوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ تو ان کا رخ وہ نہیں ہے۔ جیسا کہ پرانے طریقہ تعلیم کے حامی بتاتے ہیں۔ کمیٹی نے ایک لاکھ کے قریب روپیہ عربی اور سنسکرت کی کتابوں کے چھاپنے کے لئے مقرر کیا ہے۔ ان کتابوں کا کوئی خریدار نہیں۔ شاذونادر کہیں ایک جلد بکتی ہے۔ ..... گذشتہ تین سالوں میں ساٹھ ہزار روپیہ اس کام پر خرچ ہوا ہے۔ ان تین سالوں میں عربی اور سنسکرت کی کتابوں کی بکری سے پورا ایک ہزار روپیہ بھی نہیں آیا۔ اسی دوران میں سکول بک سوسائٹی سات یا آٹھ ہزار انگریزی کتابیں ہر سال بیچ رہی ہے۔ اور نہ صرف چھپائی کے اخراجات ادا کرتی ہے۔ بلکہ اصل زر پر بیس فی صدی منافع کما رہی ہے۔ ...... خاص اس شہر (کلکتہ) میں ہندوستانی موجود ہیں۔ جو انگریزی زبان میں علمی اور سیاسی مسئلوں پر صحت و روانی سے بحث کرنے کی کامل قابلیت رکھتے ہیں میں نے ہندوستانی شرفا کو اسی مسئلہ پر جس پر میں اب لکھ رہا ہوں ایسی وسعت نظر اور دانشمندی سے بحث کرتے سنا ہے۔ جو ہر ایک ممبر کمیٹی تعلیم کے لئے باعث فخر ہو گی۔ فی الحقیقت براعظم یورپ کے تمام علمی حلقوں میں ماسوائے پیدائشی انگریزوں کے کوئی ایسا شخص نہیں مل سکتا۔ جو اپنا مطلب انگریزی زبان میں ایسی صحت و آسانی کے ساتھ بیان کر سکے۔ جیسا کہ بہت سے ہندو کر سکتے

ہیں" میکالے کے بیان سے ظاہر ہے۔ کہ قبل اس کے کہ گورنمنٹ انگریزی تعلیم کی طرف توجہ کرے۔ انگریزی تعلیم ملک میں جاری ہو چکی تھی۔ اور اس کی وجہ ہندوستانیوں کا اپنا شوق تھا۔ اور اس شوق کی وجہ ان کی اپنی ضروریات تھیں۔ کیونکہ انگریزوں کے حکمران ہونے کی وجہ سے زبان انگریزی معاش کا بہترین ذریعہ بن گئی تھی۔ اور دیسیوں کے لئے اعزاز کا موجب تھی۔ یہی ایک وجہ ہے۔ جو سب وجوہ کی اصل اور تقویت دہندہ ہے۔ اس کی قوت قدرتی طاقتوں ہوا یا پانی بجلی کی قوتوں کے مانند ہے۔ جو کسی انسانی حکم یا تدبیر کے روکنے سے رک نہیں سکتی تھی۔ گورنمنٹ کو انگریزی دان عمال کی ضرورت اور معاش اور اعزاز کے لئے لوگوں کی خواہش دو اٹل طاقتیں تھیں۔ جن کا نتیجہ ایک ہی تھا۔ اور وہ یہ کہ ہندوستانی بچے فوج در فوج انگریزی مدارس میں داخل ہونے لگے۔ میکالے کی نیت ہندوستانیوں کو مہذب بنانے کے بارے میں بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے۔ مگر جس عظیم الشان تحریک نے اس کو یا اور لوگوں کو اس طرف مائل کیا۔ وہ جیسا کہ اوپر کے حوالجات سے ظاہر ہے وہی ہے۔ جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ تیسری وجہ جس کا میکالے نے بیان کیا ہے۔ وہ بھی گورنمنٹ کی ضرورت ہے۔ کہ ایسے لوگ ہونے چاہئیں۔ جو رعایا اور گورنمنٹ کے درمیان ترجمانی کر سکیں چوتھی وجہ جس کی طرف میکالے نے اشارہ کیا ہے۔ مگر وضاحت سے بیان نہیں کیا۔ یہ ہے۔ کہ ہندوستان کے لوگ انگریزی تہذیب میں رنگین ہو کر انگریزوں کے ایسے ہی خیر خواہ ہو جائیں جیسے کہ دنیا کے تمام مسلمان اہل عرب کے ہیں۔ یا جیسے کسی زمانے میں اہل یورپ روما کے علمی اور سیاسی اقتدار کے ماتحت تھے۔ میکالے کے اپنے الفاظ یہ ہیں: "ہمیں اس وقت ایک ایسا گروہ پیدا کرنا چاہئے۔ جو ہمارے اور ان لکھو کھہا انسانوں کے

درمیان جن پر ہم حکمرانی کر رہے ہیں۔ ترجمانی کا کام کریں۔ یہ ایک ایسے لوگوں کا گروہ ہو۔ جو خون اور رنگت میں ہندوستانی ہوں۔ مگر مذاق عقاید اخلاق اور عقل میں انگریز ہوں۔"

ان الفاظ کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے ہمیں موجودہ اور گذشتہ طاقت ور اور مہذب قوموں کا رویہ دیکھنا پڑے گا۔ اکثر قوموں کی خواہش اور کوشش یہ رہی ہے۔ کہ دنیا کی باقی قومیں ان کے رنگ میں رنگین ہو جائیں۔ ان کی زبان اختیار کر لیں۔ ان کا سا لباس پہنیں۔ انہی کا طریق معاشرت اختیار کریں۔ غرض ہر رنگ میں ان کے ایسے تابع ہو جائیں۔ جیسے ایک مرید اپنے پیر کا ہوتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال اہل عرب کا رویہ ہے۔ جن کے اثر سے عراق عرب فلسطین۔ مصر۔ طرابلس۔ ٹیونس مراکش وغیرہ ممالک اپنی زبان اپنی معاشرت۔ مذہب اور ہمدردی میں اہل عرب کے رنگ میں رنگین ہو گئے تھے۔ دوسری بڑی مثال روما کا اثر اہل یورپ پر ہے۔ یہ اور بہت سی مثالیں غالباً میکالے کے ذہن میں تھیں۔ جب اس نے یہ الفاظ لکھے۔ کہ ہمیں ایسا گروہ پیدا کرنا چاہیئے۔ جو مذاق۔ عقاید۔ اخلاق اور عقل کے لحاظ سے انگریز ہو۔ میکالے چونکہ علاوہ حکومت کا رکن ہونے کے ادیب اور مصنف بھی تھا۔ اور ایسے لوگوں کے خیالات صرف عملی دنیا کی ضروریات کو پورا کرنے تک محدود نہیں رہتے۔ بلکہ عموماً عالم تصور کی بلندیوں پر پرواز کرتے ہیں۔ اس لئے تعجب نہیں کہ میکالے کے تخیل میں دو تین برس بعد کی حالت آئی ہو۔ جب ہندوستان انگلستان کا ایک بڑا ٹکڑا ہو گا۔ جیسے آسٹریلیا اور کینیڈا انگلستان ہی کے ٹکڑے ہیں۔ اور سوائے رنگت کے انگلستان اور ہندوستان میں اور کوئی فرق نظر نہیں آتا ہو گا۔ اس یک رنگی میں وہ باہمی محبت خیر خواہی اور عقیدت بھی شامل

ہے۔ جو ہر ممنون احسان کو اپنے محسن کے ساتھ یا مرید کو اپنے پیر کے ساتھ ہوتی ہے۔

میکالے کی رائے تو ایک ذاتی رائے تھی۔ گورنمنٹ اس کے خیالات کو تسلیم کرنے کے لئے مجبور نہ تھی۔ اور نہ ہی اس کی ہر رائے میں اس کے ساتھ شریک ہونا گورنمنٹ کے لئے لازم تھا اب ہم دوسرے مراسلے کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے ۱۹ رجولائی ۱۸۵۴ء میں گورنر جنرل ہند کو ہندوستانیوں کی تعلیم کے متعلق لکھا۔ اس مراسلے میں بھی اصل وجہ وہی نظر آتی ہے۔ جس کا ہم کئی مرتبہ ذکر کر چکے ہیں۔ کہ انگریزوں کو انگریزی دان عمال کی ضرورت تھی۔ اور اس وجہ سے ہندوستانی اس علم کو فائدہ مند سمجھ کر اس کی طرف راغب ہو گئے تھے۔ اب ہم ڈائرکٹروں کے اپنے الفاظ میں ان وجوہ کی تفصیل درج کرتے ہیں۔ جو ان کے ذہن میں تھیں :- "ہماری ہمیشہ سے یہ رائے ہے۔ کہ تعلیم کے پھیلنے سے گورنمنٹ کے تمام انتظامی محکموں کا کام زیادہ خوبی سے چلیگا۔ کیونکہ ہر جگہ کے لئے سمجھ دار اور قابل اعتبار آدمی مل سکیں گے۔ اور دوسری طرف ہمیں یقین ہے۔ کہ کثیر التعداد جگہیں جن کو پُر کرنے کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ تعلیم کی اشاعت کے لئے ایک قوی تحریک ہوں گی۔" [۱۱۵]

ہمارے گورنر جنرل کے ۱۰ اکتوبر ۱۸۴۴ء کے ریزولیوشن میں تمام سرکاری ملازمتوں کے لئے عام طور پر تعلیم یافتہ کو ناتعلیم یافتہ پر ترجیح دی گئی ہے۔ بنگال کے محکمہ مال اور ہندوستان کے دوسرے حصوں کی تعلیمی رپورٹوں سے ہم یہ معلوم کرکے بہت خوش ہوتے ہیں۔ کہ گذشتہ سالوں میں ایک کثیر تعداد تعلیم یافتہ

---

[۱۱۵] مراسلہ ڈائرکٹران ایسٹ انڈیا کمپنی مطبوعہ رپورٹ کلکتہ یونیورسٹی کمیشن جلد ۵ ضمیمہ ۲ جملہ ۷

لوگوں کی سرکاری ملازمت میں آئی ہے۔ اور ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سرکاری ملازمتوں کی قلت نہیں ہے۔ بلکہ ایسے قابل آدمیوں کی قلت ہے۔ جو سرکاری ملازمت کے لائق ہوں"[۱۲] ہمیں یقین ہے۔ کہ سرکاری ملازموں کی تعلیم کے نتائج ابھی سے ظاہر ہونے لگے ہیں۔ یہ تعلیمی ترقی کا ہی نتیجہ ہے۔ اور ان اخلاق کے اختیار کرنے کا ثمرہ ہے۔ جو یورپین کتابوں میں عام طور پر پائے جاتے ہیں۔ کہ دیسی ججوں میں بہت سے اپنی قابلیت اور دیانت کے لئے اپنے ہم وطنوں میں ممتاز و مکرم ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگونکی برکات صرف اعلیٰ عہدوں ہی میں ظاہر نہیں ہوتیں۔ ہم ڈھاکہ کالج کی رپورٹ سے اقتباس کرتے ہیں۔ اور اس سے خاص خوشی ہوتی ہے۔ کیونکہ ہندوستان کے لوگوں کی فلاح کا دار و مدار اکثر افسران پولیس کی دیانت پر ہے۔ لوکل کمیٹی کہتی ہے۔ کہ بہترین شہادت مہیا کی گئی ہے۔ کہ ڈھاکہ کالج کے بعض طالبعلم داروغہ کے مشکل کام میں پورے طور پر کامیاب ہوتے ہیں"[۱۳] رڑکی کے سول انجینئرنگ طامسن کالج کی کامیابی سے ظاہر ہے۔ کہ ان کاموں کی تکمیل کے لئے جو اس وقت گورنمنٹ ہند کے ماتحت بن رہے ہیں۔ اور ہندوستانیوں کا یہ پیشہ سکھانے کے لئے جس کی اب ریلوں اور پبلک ورکس کی وجہ سے بڑی مانگ ہوگی ہندوستان میں اور جگہ بھی سول انجینئرنگ کے کالج کھولنے چاہئیں خصوصاً مدارس میں جہاں آبپاشی کا کام نہ صرف ملک کی دولت کے لئے ضروری ہے۔ بلکہ خشک سالی کے ایام میں لوگوں کی زیست کے لئے بھی لابدی ہے"[۱۴] ہم نے ہمیشہ سے تعلیمی ترقی کو ضروری سمجھا ہے۔ نہ صرف لوگوں کی دماغی ترقی کے لئے بلکہ ان

---

[۱۲] مراسلہ ڈائرکٹران ایسٹ انڈیا کمپنی مطبوعہ رپورٹ کلکتہ یونیورسٹی کمیشن جلد ۶ ضمیمہ ۲ جملہ ۴۲

[۱۳] ایضاً جملہ ۷۷   [۱۴] ایضاً جملہ ۸۰

کی اخلاقی اصلاح کے لئے بھی تاکہ آپ اعلیٰ اعتباری مناصب زیادہ وثوق کے ساتھ ان کے سپرد کر سکیں۔ ہندوستان میں لوگوں کی بہتری ہر درجے کے افسروں کی سچائی اور قابلیت کے ساتھ وابستہ ہے۔" ۱۵

ڈائرکٹر یہ بھی امید ظاہر کرتے ہیں۔ کہ تعلیمی ترقی کے ساتھ مالی ترقی بھی ہوگی۔ چنانچہ وہ یہ کہتے ہیں "مغربی علوم سے ہندوستانیوں کو پتہ لگ جائیگا۔ کہ محنت اور سرمایہ سے کیسے عظیم الشان نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ انہیں ہمارا نمونہ دیکھ کر تحریص ہوگی۔ کہ وہ بھی اپنے ملک کے وسیع ذرائع دولت کو ترقی دیں۔ اور آہستہ آہستہ مگر یقیناً انہیں وہ تمام فوائد حاصل ہوں گے۔ جو دولت اور تجارت کی صحیح ترقی سے ہوتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ہم کو یہ فائدہ ہوگا کہ بہت سی چیزیں جو ہمیں صنعت کے لئے درکار ہیں۔ اور جن کو ہماری آبادی کے سب طبقات استعمال کرتے ہیں۔ زیادہ مقدار میں اور یقینی طور پر ہمیں مل جایا کریں گی۔ اور ایسا ہی انگلستان کی مصنوعہ چیزوں کی بے انتہا خریداری ہوگی۔" ۱۶

ڈائرکٹروں کی یہ بھی خواہش ہے۔ کہ ان کے ذریعہ سے ہندوستان علم کے تمام برکات سے مستفیض ہو۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔ "یہ ہمارا مقدس فرض ہے۔ کہ ہندوستانی ان تمام مالی اور علمی برکات کے مورد ہوں۔ جو مفید علوم کی عام اشاعت سے حاصل ہوتے ہیں۔ جو کہ ہمیں امید ہے۔ خدا کے فضل کے ماتحت ہندوستان کو انگلستان کے تعلق کی وجہ سے حاصل ہوں گے۔ کیونکہ اگرچہ اب بھی انگریزی اثر کی وجہ سے بہت سی بد اخلاقی کی رسمیں اور جرائم جو صدیوں سے ان میں مروج تھے۔ دور ہوگئے ہیں۔ مگر یہ نیک اثرات اسی صورت میں پائیدار ہو سکتے ہیں۔ جب ان کے ساتھ لوگوں کی رضامندی شامل ہو۔ جو اسی صورت میں ہو سکتی ہے۔ کہ لوگ تعلیمیافتہ ہوں۔" ۱۷

---

۱۵ مراسلہ ڈائرکٹران ایسٹ انڈیا کمپنی مطبوعہ رپورٹ کلکتہ یونیورسٹی کمیشن جلد ۶ ضمیمہ ۲ جملہ ۴
۱۶ ایضاً جملہ ۴۔ ۱۷ ایضاً جملہ ۲

ڈائرکٹروں کے مراسلے کو بغور پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کو یہ امید ہے۔ کہ انگریزی تعلیم سے گورنمنٹ کو قابل اور ایماندار اہلکار ملیں گے۔ جن کے ذریعہ سے سلطنت کا کام زیادہ عمدگی سے چلے گا۔ ملک کی دولت اور تجارت بڑھیگی۔ جس سے انگلستان کو آسانی سے پیداوار کی ضروری اشیاء مل سکیں گی۔ اور وہاں کی مصنوعات کی خریداری کا میدان وسیع ہوگا۔ اور ہندوستانیوں کی علمی اور اخلاقی حالت ترقی کرے گی۔ جس کی وجہ سے ملک میں جرائم کم ہوکر امن قائم ہو جائے گا۔

گورنمنٹ انگلشیہ کو اس وقت شاید یہ خیال نہیں تھا۔ کہ یہی لوگ انگریزی تعلیم پاکر مساوی حقوق کا مطالبہ کریں گے۔ اس وقت اگر یہ بات ایسی واضح ہوتی۔ تو شاید بہت سے لوگ ابتداہی سے اعلیٰ انگریزی علوم کی مخالفت کرتے۔ میکالے کے سامنے بھی اگر اس وقت کے ہندوستان کا نقشہ ہوتا۔ تو شاید وہ ایسے زور سے انگریزی تعلیم کی تائید نہ کرتا۔ ہمیں یہ الفاظ لکھنے کی جرٔت اس لئے ہوئی ہے۔ کہ اس وقت ایک فریق موجود ہے۔ اور معلوم نہیں۔ اس کی وسعت کس قدر ہے۔ جس کا یہ خیال ہے۔ کہ انگریزی علوم کی اشاعت سے ہندوستانی انگریزی گورنمنٹ کے وفادار نہیں رہے۔ اور اس فریق کی یہ بھی خواہش معلوم ہوتی ہے۔ کہ آئندہ یورپین فلسفہ سیاسیات کی اشاعت سلطنت کے لئے مضر ہوگی۔ ہم نمونے کے طور پر مسٹر ریس کی کتاب The Real India (حقیقی ہندوستان) سے چند اقتباسات درج کرتے ہیں۔ جن سے ان خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ مسٹر ریس نے ۲۵ سال ہندوستان میں سول سروس میں ملازمت کی اور وائسرائے کی کونسل کی ممبری تک پہنچے۔ آپ فارسی۔ ہندوستانی۔ تامل اور تلیگو زبانوں میں ماہر تھے۔ ہندوستان سے واپس جاکر آپ ممبر پارلیمنٹ ہو گئے۔ اور وہیں ۱۹۱۰ء میں آپ نے یہ کتاب

لکھی - آپ لکھتے ہیں "بد قسمتی سے جو ہندوستان میں چند دنوں سے بد امنی پھیل رہی ہے - اس کا سب سے بڑا سبب وہ طریقہ تعلیم ہے - جس کو ہم نے خود جاری کیا - جہاں تک کہ اس کے جاری کرنے والوں کی محدود نظر کام کر سکتی تھی - یہ مصلحت پر مبنی تھا - مگر اس کے لازمی نتائج کی طرف خیال کیا جائے - انہوں نے تو اندھوں کی طرح کام کیا ہے - یہ کہنا کوئی زیادتی نہیں - کہ ہمارے سکولوں میں لڑکے اپنے روزانہ سبق میں بغاوت کی تعلیم حاصل کرتے ہیں - وہ - روسو میکالے اور دیگر فلاسفروں کی کتابیں پڑھتے ہیں - جو آکسفورڈ میں بھی طالبعلموں کے دماغوں کو خراب کر کے سوشیلزم اور دیگر ناقابل عمل خوابوں کی طرف مائل کر دیتی ہیں - اور ہندوستان کے نوجوانوں پر جو پہلے ہی سے فلسفہ کی طرف مائل اور حفظ یاد کرنے میں بہت تیز ہوتے ہیں اور بھی قوی اثر پیدا کرتی ہیں - ان میں سے اکثر نادار ہوتے ہیں - اور سوائے گورنمنٹ کے ماتحت کلرکی کرنے کے ان کا اور کوئی ذریعہ معاش نہیں ہوتا - اور جب تک گورنمنٹ سے انہیں تنخواہ نہیں ملتی - وہ گورنمنٹ کو ظالم کہہ کہہ بدنام کرتے ہیں -

"اس طریق سے جو غیر مطمئن لوگ پیدا ہوتے ہیں - وہ نہ گورنمنٹ سے ڈرتے ہیں - اور نہ اس کی عزت کرتے ہیں - اور یہ تعجب کی بات بھی نہیں - کیونکہ جن کتابوں کی وہ ہمارے سکولوں میں تعلیم پاتے ہیں - ان میں ہر ایسی گورنمنٹ پر جرح قدح کی گئی ہے - جس کی بنا تحکم پر ہو" ۱۸ھ

دوسری جگہ پر پھر لکھا ہے :- سولہ برس گذر گئے ہیں - جب سر ولیم ہنٹر نے لکھا تھا - کہ آج کل کے ہندوستان کی خصوصیت نیشنل کانگرس ہے - وہ لکھتے ہیں - کہ تعلیمی اصلاح اور اپنے

۱۸ھ The Real India مصنفہ J. D. Rees باب ۸ ص ۱۶۲

سکولوں اور کالجوں کا دروازہ بغیر امتیاز مذہب قوم اور نسل سب لوگوں کے لئے کھولدینے کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ وہ ہندوستان جو پہلے دشمن تھا۔ اب وفادار ہوگیا ہے۔ مگر اس وقت ہم دیکھ رہے ہیں۔ کہ نتیجہ یہ ہوا ہے۔ کہ ایک انگریزی دان جماعت پیدا ہو گئی ہے۔ جو کوئی خاص طور پر وفادار نہیں کہلا سکتی۔ لیکن اگرچہ سر ولیم ہنٹر نے کانگرس کے متعلق پیش گوئی کرنے میں غلطی کھائی ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے۔ کہ عوام کے متعلق اس کی پیش گوئی درست ہے۔ اور وہ کہنے میں راستی پر تھا۔ کہ اس کے زمانے تک بھی ہندوستان کی روش معاندانہ تھی۔ اور کمپنی کے ملازم دلجوئی کی پالیسی میں ناکام رہے۔ ہنٹر نے اس سوال کا جواب کہ کیا ہم ہندوستان کو راضی کر سکتے ہیں۔ وثوق کے ساتھ اس بات میں دیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ کہ ان لوگوں کی خواہش جن کو ہم بعض اوقات سنتے ہیں۔ کہ تنگ کرنے والی جماعت کہا جاتا ہے۔ یہ نہیں ہے۔ جیسا کہ لارڈ میٹکاف کے وقت میں تھی۔ کہ وہ ہماری گورنمنٹ سے آزادی حاصل کریں۔ بلکہ ان کی خواہش یہ ہے۔ کہ انہیں گورنمنٹ کے کاموں میں شریک کیا جائے"۔ ؁۱۹

"سر الفرڈ لائل نے اپنی کتاب ایشیاٹک سٹڈیز کے دوسرے اڈیشن میں ان لوگوں سے اتفاق نہیں کیا۔ جو انگریزی حکومت کو ہندوستان میں عارضی اور وقتی سمجھتے ہیں۔ مگر وہ اس بات کو ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ آسودگی تعلیم اور مغربی طریقوں کے ساتھ واقفیت ہونے کے بعد لازم ہے۔ کہ ماتحت لوگوں کو سیاسی حقوق بھی دئے جائیں۔ جو حکومت کی شان و قوت کے منافی نہ ہوں۔ ان کا یہ خیال نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس وقت یہ میرا خیال ہے

؁۱۹ ایضاً باب ۱ ص ۲۱۹

کہ موجودہ شورش انگریزی حکومت کو بہالے جائیگی۔ اس حکومت کے ماتحت وہ حالات نہیں رہے۔ جن سے طاقتور دیسی حکمران اور زبردست خاندان پیدا ہو سکیں۔ بابو سریندر ناتھ بنیرجی اور بابو بی سی پال مین اور حیدر علی اور سیواجی میں زمین آسمان کا فرق ہے"۔ ۵۲۰ ....

ہمیں پورے ارادے سے تعلیم کے مسئلہ کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ اور لارڈ کرزن کی دلیرانہ پالیسی کی اقتدا کرنی چاہئے۔ جس کا مقصد یہ ہے۔ کہ ہمیں نیم عالم اور پورے مفسد بی اے بنانے کے لئے امداد نہیں کرنی چاہئے۔ میں سمجھتا ہوں۔ کہ اس فیصلے کو منسوخ کرنے کے لئے جو انگریزیت کے حامیوں کے حق میں ہوا تھا۔ اب بہت وقت گذر گیا ہے۔ مگر کیا کوئی وجہ ہے۔ کہ ہربرٹ اسپنسر کو اس طریق تعلیم میں ایسی ممتاز جگہ دی جائے"۔ ۵۲۱

مسٹر ریس کا اشارہ اس فیصلے کی طرف ہے۔ جو میکالے کی تحریک پر ہوا تھا۔ کہ سرکاری مدارس میں صرف مشرقی علوم نہ پڑھائے جائیں۔ بلکہ مغربی علوم کی بھی تعلیم دی جائے۔ مسٹر ریس کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اگر مغربی تعلیم اس وقت جاری نہ کی جاتی تو اچھا ہوتا۔ مگر اب اس کو بدلنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ اتنا عرصہ گذر گیا ہے۔ ایک اور جگہ بھی مسٹر ریس میکالے کا ذکر کرتے ہیں"۔ دو فریق ہو گئے تھے۔ ایک انگریزی علوم کے حامی دوسرے مشرقی علوم کے۔ پہلے یہ کہتے تھے۔ کہ مغربی علوم . . . انگریزی زبان میں پڑھانے چاہئیں۔ اور دوسرے یہ کہتے تھے۔ کہ دیسی زبان کے ساتھ قدیم مشرقی زبانیں پڑھانی چاہئیں۔ انگریزیت کے حامی لارڈ میکالے کی سرگردگی میں جیت

---

۵۲۰ ایضاً ص ۳۴۲ ۵۲۱ ایضاً ص ۳۴۳

گئے۔ میکالے کی اس موقعہ کی تحریر جس کی اکثر مدح سرائی کی گئی ہے۔ اور جس میں شیرے اور مکھن کے سمندروں اور تیس فٹ لمبے بادشاہوں پر ہنسی کی گئی ہے۔ حقیقت میں نہایت ہی سطحی تحریر اور استدلال کا نمونہ ہے۔" ۵۲۲

مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم انگلستان نے بھی حال ہی پارلیمنٹ میں انگریزی تعلیم کے متعلق اسی قسم کا خیال ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں "ہندوستان میں بے امنی کے اسباب کیا ہیں غالباً بہت سے اسباب ہیں۔ ایک آبادی ہے۔ جن کے مشرقی خیالات ہیں۔ اور جن کا صدیوں کا تجربہ مشرقی طریق کا ہے۔ جمہوریت کا نام کبھی ان کی تاریخ میں نہیں آیا۔ زمانہ حال کے خیالات۔ مغربی خیالات۔ آزادی اور خود حکومتی کے خیالات سے وہ بے خبر تھے۔ وہ بڑے بڑے راجاؤں کے ماتحت رہنے کے عادی تھے جو اگر طاقتور ہوتے تھے تو امن قائم کر سکتے تھے۔ اور اگر کمزور ہوتے تھے۔ تو بدامنی رہتی تھی ہم نے ان کو انگریزی تعلیم دی۔ مجھے تعجب ہوتا ہے۔ کہ ہندوستانی بچوں کو کس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ اس تعلیم سے ہندوستانی دل زہر آلود ہو گئے۔ بہت سے امیر ہندوستانی اپنے لڑکوں کو انگریزی یونیورسٹیوں میں تعلیم کے لئے بھیجتے ہیں۔ مغربی خیالات ان میں بھر جاتے ہیں۔ اور وہ ان خیالات کو لیکر واپس ہندوستان جاتے ہیں۔ مغرب کے آزادی کے خیال ان کے مطمع نظر بن جاتے ہیں۔ پس لازم تھا۔ کہ بے امنی پیدا ہو۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے پرانی بوتلوں میں نئی شراب ڈالی جائے۔ ان مشرقی پرانی بوتلوں میں مغرب کا تیز اور خطرناک شراب ڈالی گئی۔ جو نرم عرقوں کی عادی تھیں۔ تیز اور اکثر اوقات

---

۵۲۲ ایضاً ص ۵۲

مغرب کی غیر مصفا شراب ان میں ڈالی گئی۔ وہ پھٹ گئیں۔ اور شراب بہ گئی۔ اور تمام مشرق مخمور ہو گیا"۔ [۲۳]

غرضیکہ یہ ایک عام خیال ہے۔ جو ان لوگوں کے دل میں ہے۔ جو انگریزی حکومت کے استحکام کو فرض اول سمجھتے ہیں۔

حقیقت میں ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریزوں کی نسبت مغایرت کا خیال بہت گہری وجوہ پر مبنی ہے۔ انگریزی تعلیم سے اس خیال میں اگر کچھ ترمیم ہوئی ہے۔ تو وہ یہ ہوئی ہے۔ کہ انہوں نے مغربی ممالک کے طریق پر کانسٹی ٹیوشنل ایجی ٹیشن (آئینی مجادلہ) کو اختیار کر لیا ہے۔ جیسے مسٹر ریس خود لکھتے ہیں۔ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستانیوں کو راضی نہ کر سکی۔ پرانے خیال والوں کے دلوں میں انگریزوں کی طرف سے نفور بہت زیادہ تھا۔ چنانچہ کسی پرانے عالم کی نسبت سنا ہے۔ کہ جب اسے ایک انگریز سے مجبوراً ہاتھ ملانا پڑا۔ تو اس انگریز کے چلے جانے کے بعد اس نے مٹی پر ہاتھ رگڑ رگڑ کر دھویا۔ ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان تفاوت پیدا کرنے والی دو بڑی چیزیں ہیں۔ ایک تو ہندوستانیوں کا مذہب ہے۔ جو انہیں اپنی قومیت کو بھولنے نہیں دیتا۔ اور دوسرا انگریزوں میں نسلی اور سوشل برتری کا خیال ہے۔ جس کی وجہ سے وہ کبھی بھول نہیں سکتے۔ کہ وہ ان سے علیحدہ اور افضل ہیں۔ جب تک یہ دو دیواریں بیچ میں حائل ہیں۔ ان دو قوموں کا اتحاد ممکن نہیں۔ انگریزی تعلیم کو ناحق بدنام کر رہے ہیں۔ غالباً چونکہ اکثر ہندوستانی پالٹیشن اپنی تقریروں میں انگریزی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے انگریز خیال کر لیتے ہیں۔ کہ یہ خیالات انہوں نے انگریزی کتابوں ہی سے سیکھے ہیں۔ حقیقت

---

[۲۳] ٹریبون ۱۲ مارچ سنہ ۱۹۲۲ء

میں خیال تو ایک ہی ہے۔ جس کے اظہار کے مختلف طریقے ہیں۔ جو بطور لباس کے ہیں۔ خواہ وہ لباس انگریزی کتابوں سے لیا جائے۔ یا عربی اور سنسکرت کی کتابوں سے۔ وہی ایک خیال منبع تمام خیالوں کا ہے۔ اگر آج انگریزی تعلیم بند ہو جائے۔ تو اسی خیال کے لیئے عربی اور سنسکرت فقرے پرانی کتابوں سے نکال کر رکھ دئے جائینگے چنانچہ اب بھی ایک حد تک یہ پرانی زبانیں اس کام کے لیئے استعمال کی جاتی ہیں۔ وہ خیال یہ ہے۔ کہ ہم غیر ہیں۔ اور تم غیر ہو۔ ہندوستانی بھی اس خیال کو دہراتے ہیں اور انگریز بھی۔ چنانچہ انگریزی شاعر رڈیارڈ کپلنگ نے اس کا اظہار ایک شعر میں کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے :-

مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب ہے
اور یہ دونوں کبھی آپس میں مل نہیں سکتے

یہی غیریت مختلف ناموں اور مختلف صورتوں میں خواہ وہ سیاسی ہوں یا غیر سیاسی ظاہر ہوتی رہی ہے۔ اور ہوتی رہے گی۔

تعجب ہے۔ کہ اس خیال کا روزانہ احساس کر کے انگریز سیاسی بے امنی کی وجوہ تلاش کرنے کے لیئے کسی اور طرف جاتے ہیں۔ اگر محض انگریزی تعلیم کا اثر ہوتا۔ تو لوگ پارلیمنٹری حکومت کے دلدادہ ہوتے۔ مگر غالباً لوگوں کو جمہوری حکومت کی اتنی خواہش نہیں ہے۔ جتنی اپنی حکومت کی خواہش ہے۔ خواہ اس کی شکل کچھ ہی ہو۔ اور اکثر لوگ جمہوریت کی حقیقت کو بھی نہیں سمجھتے۔

دوسرا باب

مغربی علوم کے اقسام اور ان کے فوائد کا مقابلہ
ہندوستان کی توجہ کن علوم کی طرف ہے

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے۔ کہ مغرب میں وہ کون سے علوم تھے۔ جو ہندوستان میں نہیں تھے۔ اور جن کا حاصل کرنا ہندوستان کے لئے فائدہ مند ہو سکتا تھا۔ ہمارا مقصد یہ نہیں ہے۔ کہ ہم تمام مغربی علوم کی تشریح کریں۔ اور ان کا قدیم ہندوستانی علوم کے ساتھ مقابلہ کر کے ثابت کریں۔ کہ یہ علوم مغرب میں زیادہ ترقی یافتہ تھے۔ اور اس لئے ان کا حاصل کرنا ہندوستان کے لئے مفید ہو سکتا تھا۔ یہ بحث اس موقعہ پر لاحاصل ہو گی۔ کیونکہ بہت سے مغربی علوم کی فوقیت ایک ثابت شدہ امر ہے۔ اور اگر سب کی نہ بھی ہو۔ تو جن علوم پر ہم زور دینا چاہتے ہیں۔ ان کی فوقیت میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ اس مضمون کے لئے ہم تمام علوم کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک وہ علوم جن کا مقصد اشیاء کی ماہیت دریافت کرنا یا نفیس جذبات اور کیفیات کا اظہار کرنا ہے۔ اس حصے میں وہ تمام علوم آجاتے ہیں۔ جو ہندوستان یا اور ممالک کی یونیورسٹیوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔ مثلاً علوم سائنس کے مختلف شعبے۔ فلسفہ۔ تاریخ۔ علم ادب وغیرہ۔ دوسرا حصہ ان علوم کا ہے۔ جن کو عام طور پر فنون کہا جاتا ہے مگر اس زمانے میں قیاسی علوم کا انہیں اس قدر دخل ہو گیا ہے۔ کہ انہیں بھی علوم میں شمار کرنا چاہئے۔ یہ علوم وہ ہیں۔ جن کے ذریعہ سے ملک میں آسودگی اور قوت پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً زراعت کے علمی طریق جن کی مدد سے پیداوار میں ترقی ہو سکتی ہے۔ یا

صنعت کے طریقے جن سے کپڑا۔ آہنی اشیاء مشینیں اور ہر قسم کی انسانی آسائش کی چیزیں بن سکتی ہیں۔ اگرچہ زراعت اور صنعت کے فنون کی ترقی ان اصولوں پر ہوئی ہے۔ جن کا قیاسی علوم میں بھی ذکر ہوتا ہے۔ مگر کسی چیز کے بنانے کی اصولی واقفیت حاصل کر کے کوئی شخص مزید عملی مہارت پیدا کئے بغیر ان چیزوں کو بنا نہیں سکتا۔ اس لئے ملک کی تعلیمی ضروریات پر بحث کرتے ہوئے ہمیں ان دو قسم کے علوم کو اپنے فوائد اور نتائج میں ایک دوسرے سے جدا سمجھنا پڑیگا۔

ہر ملک میں ایک قلیل تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے۔ جن کو حق و باطل میں تمیز کرنے اور نئے حقائق دریافت کرنے کا ایسا ہی شوق ہوتا ہے۔ جیسا باقی لوگوں کو کھانے پینے اور دنیوی عیش و آرام کا۔ یہ لوگ دنیا کے حقیقی رہنما ہیں۔ اور انسانی ترقی کا دار و مدار انہی کی کوششوں پر ہے۔ یہ لوگ نوع انسان کے لئے بمنزلہ دماغ کے ہیں۔ انہی کے سوچنے سے باقی لوگ سوچتے ہیں۔ اور انہی کے قائم کردہ راستوں پر تمام لوگ چلتے ہیں۔ خواہ بظاہر ان لوگوں کی وہ قدر و منزلت ہو یا نہ ہو۔ جس کے وہ مستحق ہیں۔ مگر ان کے خیالات میں وہ قوت و تاثیر ہوتی ہے۔ کہ تمام لوگوں کے دلوں پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ انہی لوگوں کے خیالات کی اشاعت کا نام تعلیم ہے۔ اور انہی کے خیالات کے مجموعہ کا نام علم ہے۔ ایسے لوگ ہر ملک کے لئے عزت و فخر کا موجب ہیں۔ اور اگرچہ ان کی تحقیقاتوں سے جلدی مادی فوائد صادر نہ ہوں۔ انسان کی علمی ترقی کا واحد ذریعہ ہیں۔ اور اکثر اوقات ان کی علمی تحقیقاتوں سے وہ مادی نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ کہ ان کے آرام و آسائش کے لئے سامان بہم پہنچانا اور ان کو مادی تفکرات سے مستغنی کر دینا ملک کی ترقی کے لئے بہترین تدبیر ہے۔ ایسے لوگ ظاہر میں ملک کی دولت کو خرچ کرتے ہیں۔ اور اس کے پیدا کرنے کے

لئے کچھ امداد نہیں دیتے۔ مگر حقیقت میں اتنی دولت پیدا کرتے ہیں کہ اس کا ہزارواں حصہ بھی ان کے اپنے کام نہیں آتا۔ اور تمام کا نفع نوع انسان کو پہنچتا ہے۔

ایسے لوگوں کو چھوڑ کر باقی انسانوں کا اولین فرض ہے۔ کہ وہ اپنے وقت کا زیادہ حصہ ملک کے لیئے دولت و قوت پیدا کرنے میں خرچ کریں۔ اور ایسے علوم حاصل کریں۔ جن سے مقصد حاصل ہو۔

دولت دو قسم کی ہے۔ ایک قدرتی پیداوار اور دوسری مصنوعات تمام زمینی پیدائشیں خواہ وہ اناج اور میوہ جات ہوں یہ سب دولت کے مفہوم میں شامل ہیں۔ ہر قدرتی چیز جو زمین سے یا کرہ ہوائی میں سے یا کہیں سے پیدا کی جا سکتی ہے۔ اور انسان کے کام آسکتی ہے۔ انسان کے لئے دولت ہے۔ سونا چاندی بھی دولت ہیں۔ مگر ان کی حقیقی قیمت بھی وہ نہیں ہے۔ جو دنیا میں عام طور پر شمار کی جاتی ہے۔ ان کی حقیقی قیمت وہی ہے۔ جو ایک دھات ہونے کی حیثیت سے ان کو حاصل ہے۔ یعنی جتنا فائدہ ایک برتن یا اوزار کی صورت میں کسی انسان کو پہنچا سکتی ہیں۔ ان کی ظاہری قیمت کی وجہ یہ ہے۔ کہ ان کے توسط سے حقیقی دولت یعنی انسان کی ضرورت کی اشیاء حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اگر کسی وجہ سے ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک سے اناج کپڑا یا دوسری ضرورت کی چیزیں حاصل نہ کر سکیں۔ تو جو چاندی یا سونا ان کے پاس ہوگا۔ اس کی قیمت کم ہو جائیگی۔ دوسرے لفظوں میں ان کی ضرورت کی اشیاء مہنگی ہو جائیں گی۔

دوسری قسم کی دولت وہ ہے۔ جو انہی قدرتی اشیاء کی ترمیم کر کے ان کے فائدے کو بڑھا کر پیدا کی جاتی ہے۔ گویا انسانی محنت کے ساتھ مل جانے سے قدرتی اشیاء کی قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً اناج پر جب انسان محنت کر کے روٹی پکاتا ہے۔ تو

اناج کی قیمت روٹی کی شکل میں تبدیل ہونے سے بڑھ جاتی ہے۔ یا مٹی سے جب برتن بناتا ہے۔ تو برتن کی صورت میں تبدیل ہو جانے سے مٹی کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ بہت سی قدرتی پیداواریں اسی قسم کی ہیں۔ کہ انسانی محنت سے ان کی قیمت میں سینکڑوں گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ لوہا جو زمین سے نکلتا ہے۔ اور وہ مشین جو اس سے بنتی ہے۔ ان دونوں کی قیمت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ غرضیکہ انسانی محنت اور ہنر بھی ایک بیش بہا خزانہ ہے جس کی قیمت قدرتی پیداوار سے کم نہیں۔

اور چونکہ قدرتی پیداوار کا حاصل کرنا بھی انسانی محنت اور ہنر پر منحصر ہے۔ اس لحاظ سے انسانی محنت اور ہنر قدرتی پیداوار سے بھی زیادہ قابل قدر ہیں۔ اس زمانے کی ترقیات سے ثابت ہو گیا ہے۔ کہ بغیر ان علوم کے انسان کو موجودہ آسائش اور آرام کا دسواں حصہ بھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ یہی دو ذریعے دنیا میں دولت پیدا کرنے کے ہیں۔ ان کو اختصار کی خاطر ہم زراعت اور صنعت کہیں گے۔ زراعت میں تمام قدرتی پیداوار شامل ہے۔ خواہ وہ اناج ہو یا معدنیات ہوں۔ یا کیمیاوی اشیاء ہوں۔ اور صنعت میں تمام وہ علم و ہنر شامل ہیں۔ جن کے ذریعہ سے قدرتی پیداوار کی قیمت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

ہر ملک کے لئے ان دو قسم کے آدمیوں کی ضرورت ہے۔ ایک تو وہ جو مادی یا روحانی علوم میں نئے حقائق پیدا کریں۔ خواہ ان حقائق کا مادی نتیجہ ہو یا نہ ہو۔ بہت سے ایسے علوم بھی ہیں۔ جن کا براہ راست مادی نتیجہ نہیں ہوتا۔ مگر بالواسطہ بہت عظیم الشان نتائج پیدا ہوتے مثلاً فن مصوری بظاہر ایک علم محض انسان کی تفریح طبع کے لئے معلوم ہوتا ہے۔ ایک مصور جو دس برس خرچ کر کے ایک شخص کی تصویر بناتا ہے۔ وہ دنیا کو مادی فائدہ خود تو کچھ نہیں پہنچاتا۔

مگر انسانی چہرے میں جن نئی کیفیتوں کا مطالعہ کر کے جن طریقوں سے وہ ان کو تصویر میں ادا کرتا ہے۔ وہ طریقے اور وہ کیفیات انسانی علم میں اضافہ ہیں۔ اور جب اسی ترقی یافتہ مصوری کا استعمال علم تشریح الابدان۔ علم نفسیات۔ علم حیوانات۔ علم نباتات۔ علم جمادات علم طبعیات اور علم جنگ وغیرہ میں کیا جائے۔ تو اس سے براہ راست مادی نتیجے پیدا ہوتے ہیں۔ جنگ میں ایک صحیح یا غلط نقشے پر جو مصور نے محض آنکھ سے اندازہ کر کے بنایا ہے۔ قوموں کی فتح و شکست کا دارومدار ہو سکتا ہے۔ اس قابلیت کے لوگ جو محقق بن سکیں ہر ملک میں کم ہیں۔ اور اگر ہر آبادی میں کثرت ان لوگوں کی ہوتی تو ان کی ایجادات سے اتنا فائدہ نہ اٹھایا جا سکتا۔ جتنا کہ اب اٹھایا جا رہا ہے۔ کیونکہ ان کے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سامان کی ضرورت ہوتی۔ اور اتنا سامان پیدا کرنے والے آدمی موجود نہ ہوتے۔ اگر کسی ملک میں تمام آدمی اپنا تمام وقت ایجاد اور تحقیقات پر خرچ کریں۔ تو سوائے اس کے کہ وہ چند دن میں بھوک سے مر جائیں۔ اور کوئی نتیجہ نہ ہوگا۔ جب تک کہ وہ اپنے وقت کا ایک معتدبہ حصہ مادی ضروریات کے مہیا کرنے میں خرچ نہ کریں۔ مگر کسی ملک میں ایسی حالت پیدا ہونے کی توقع نہیں ہے۔ کیونکہ ایسے آدمی جو تحقیقات کر سکیں۔ اتنے بھی نہیں جتنوں کی ہر ملک کو ضرورت ہے۔ ایک اور فائدہ قدرت نے انسان کے لئے یہ رکھ دیا ہے۔ کہ انسان کی تحقیقات کا شوق اکثر مادی چیزوں کے متعلق ہے۔ اور جب تک انسان مادی اشیاء کو نہ دیکھے۔ بغور ان کا مطالعہ کر کے ان سے کام نہ لے۔ تب تک صحیح نتائج نہیں پیدا ہو سکتے۔ علم دماغ کے اندر سے پیدا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ بعض لوگوں کا قاعدہ ہے۔ کہ آنکھیں بند کر کے گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں اور شاید خیال کرتے ہیں۔ کہ کہیں سے انہیں الہام ہو جائیگا۔

بلکہ علم اشیاء کا مطالعہ کرنے اور ان سے عملی کام لینے کی صورت میں ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ اور جب انسان آنکھیں بند کر کے بیٹھتا ہے تو اس وقت بھی اس کے ذہن میں اشیاء کی تصاویر موجود ہوتی ہیں۔ جن کا وہ مطالعہ کرتا ہے۔

دوسری قسم کے آدمی جن کی ہر ملک کو ایک کثیر تعداد میں ضرورت ہے۔ وہ ہیں۔ جو ملک کے لئے مادی اشیاء مہیا کریں۔ دولت اور آسودگی خود محبوب چیزیں ہیں۔ اور ان کے حق میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مگر دولت اور آسودگی کے ہونے یا نہ ہونے سے بعض اخلاقی اور روحانی نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ جن کی طرف قومی دولت کے۔ معنے کسی ملک میں چاندی سونے کا جمع کرنا نہیں ہے بلکہ ان تمام اشیاء کی موجودگی ہے۔ جن کی قوم کو ضرورت ہے مثلاً خوردنی اشیاء۔ کپڑا۔ مشینیں وغیرہ۔ اس لحاظ سے اگر ایک قوم کے پاس دوسری قوم کی نسبت روپیہ زیادہ بھی ہے۔ تو اگر اس کے پاس اپنی ضروریات زندگی کے سامان نہیں۔ تو وہ غریب ہے۔ روپے کی بجائے کاغذ کے نوٹ چل سکتے ہیں۔ مگر گیہوں کے دانے کی بجائے کوئی شخص کاغذ کا پرزہ کھا کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور ریل کے پہیئے کی جگہ کاغذ کے پہیئے سے کام نہیں لے سکتا۔ جو قوم دوسری قوم کی محتاج ہوگی۔ اس کے ماتحت ہوگی خواہ وہ ماتحتی کا اقرار کرے یا نہ کرے۔ ایک ملک جس کو اپنی ریلیں بنانے کیلئے۔ اپنے جہاز بنانے کیلئے اپنے پل بنانے کے لئے اپنی کانیں کھودنے کے لئے ہتھیار بنانے کے لئے دوسری قوم کا دست نگر ہونا پڑتا ہے۔ وہ اس قوم کی وفادار رعایا ہے۔ خواہ وہ اس کو تسلیم کرے یا نہ کرے۔ اس کو اس قوم کی مرضی کے مطابق کام کرنا پڑے گا۔ اور یہ اس قوم کی کوئی مصلحت ہوگی۔ اگر وہ باقاعدہ اس ملک پر قبضہ نہیں کر لیتی۔ جب تک یہ قوم اپنی اقتصادی

محتاجی سے نہیں نکلتی۔ آزاد اور خود مختار کہلانے کی مستحق نہیں ہے۔ غرضیکہ مادی ترقی نہ صرف ملک کی آسودگی کے لئے ضروری ہے۔ بلکہ ملک کی آزادی قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ اور کسی آزادی کا حاصل کرنا بغیر اس مادی ترقی کے موجودہ حالات عالم میں ممکن نہیں ہے۔

اس زمانے میں مادی ترقی نہ صرف آسودگی کا ذریعہ ہے۔ بلکہ دنیا کی طاقت در قوموں کی طاقت کا اصل راز یہی ہے۔ ایک زمانہ تھا۔ کہ جب جسمانی طاقت ایک قوم کو دوسری پر غالب کر دیتی تھی۔ فیصلہ کن ہتھیار تلوار ہی تھی۔ اور تلوار سے بھی زیادہ قوت بازو جو تلوار کے نقائص بھی رفع کر دیتی تھی۔ دو لڑنے والی فوجوں میں سے جس فوج میں دلیری اور جسمانی قوت زیادہ ہوتی تھی۔ وہ دوسری پر غالب آجاتی تھی۔ تدبیر جنگ کا بھی کچھ دخل تھا۔ اور ہتھیار بھی قسم قسم کے ہوتے تھے۔ مگر اصلی دارومدار نتیجے کا جرأت اور جسمانی قوت پر ہوتا تھا۔ وہ زمانہ گذر گیا۔ جب ایک پٹھان گھر سے تلوار باندھ کر ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے تک پہنچ جاتا تھا۔ اور اپنی تلوار کے زور سے خوراک بھی حاصل کرتا تھا۔ اور ملک پر بھی قبضہ کرتا جاتا تھا۔ اب زمانہ اور ہے۔ اور اگرچہ ہتھیاروں میں بھی بہت ترقی ہو گئی ہے۔ اور جرأت اور انتظام میں بھی بہت ترقی ہوئی ہے۔ اور فن جنگ میں بھی بہت ایجادیں ہوئی ہیں۔ مگر جنگ کا آخری فیصلہ کرنے والی قوت مادی سامان ہے۔ ہر شخص نے اس جنگ میں جو ابھی یورپ میں گذر چکی ہے۔ مشاہدہ کیا ہوگا۔ کہ جرمنی باوجود بہتر ہتھیاروں کے اور بہتر تدبیر جنگ کے اور مساوی جرأت اور بہتر انتظام کے آخر شکست کھا گیا۔ اس شکست کی وجہ مادی سامان کا ختم ہو جانا تھا۔ جس کی وجہ سے جرمن فوجوں کو پیرس کے قریب پہنچ کر واپس آنا پڑا۔ اگر اس حملے میں وہ پیرس لے لیتے۔ تو یہ شکست ایسی بری نہ ہوتی۔ چونکہ مقررہ میعاد میں فرانس

اور انگلستان کے مقابلے کی وجہ سے وہ پیرس لینے میں ناکام رہے۔
خوراک کے ختم ہو جانے کی وجہ سے فتح شکست کی صورت میں تبدیل
ہو گئی۔ لڑائی کے دوران میں ہر ایک نے مشاہدہ کیا ہو گا۔ کہ
انگلستان۔ فرانس اور جرمنی کے کارخانے دن رات سامان جنگ
کے تیار کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ سامان جنگ میں کپڑا خوراک
بوٹ وغیرہ معمولی روزمرہ کے استعمال کی چیزیں بھی شامل ہیں۔
ان کے علاوہ ریل اور جہاز بھی جن کے ذریعہ سے سامان جنگ
سپاہیوں تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ جس بات نے انگلستان فرانس
وغیرہ اتحادیوں کو بچا لیا۔ وہ ان قوموں کے جہاز تھے۔ خصوصاً
انگلستان کے جہاز جو دنیا کے ہر کونے میں تمام ضرورت کی اشیاء
لاتے تھے۔ اور جس کی نے جرمنی کو تباہ کیا۔ وہ یہی تھی۔ کہ جرمنی
کے جہاز جہاں تھے۔ وہیں بند پڑے تھے۔ اور انگلستان کی بحری
طاقت کے ڈر سے باہر نہیں آ سکتے تھے۔ ترکوں کی شکست کی وجہ
بھی ملک میں ضروری مشینوں اور سامان کا نہ بن سکنا تھا۔ ورنہ
شجاعت اور نہ تدبیر جنگ میں وہ کسی سے کم نہ تھے۔ ریل آبی جہاز
ہوائی جہاز اور موٹر کار وہ زنجیریں ہیں۔ جن کے ساتھ طاقتور قومیں
کمزور اقوام عالم کو جکڑ کر قبضہ کر رہی ہیں۔ یہ زنجیریں نئی ایجادوں
کی وجہ سے دن بدن مضبوط ہو رہی ہیں۔ یہ زنجیریں توڑنے سے
نہیں ٹوٹ سکتیں۔ اگر کوئی شخص چاہے۔ کہ ہم ان طاقتور کلوں
کو چھوڑ کر پرانے زمانے کی سادہ بے سامان زندگی بسر کریں۔ تو
ممکن نہیں۔ کہ وہ دیر تک آزادی تو ایک طرف اپنی ہستی کو بھی
قائم رکھ سکے۔ وہ تو چھوڑ چھاڑ کر بے سروسامان ہو سکتا ہے۔
مگر جب تک تمام دنیا اس کی مانند بے سروسامان نہ ہو جائے۔
وہ دوسری اقوام کی تعدی سے سلامت نہیں رہ سکتا۔ اس
لئے اس جبر سے سوائے اس کے اور کسی طریق پر نجات نہیں ہو

سکتی۔ کہ انسان خود بھی ساحر بنے اور سحر کا مقابلہ سحر سے کرے۔ ایک وقت آرہا ہے۔ جب نئی ایجادوں کی وجہ سے طاقتور قوموں کی قوت اور بھی بڑھ جائیگی۔ اور کمزور اقوام کا ضعف اور بھی زیادہ ہو جائیگا۔ اس وقت کسی کمزور قوم کے لئے اتنا بھی ممکن نہ ہوگا۔ کہ طاقتور اقوام کا چند دن بھی مقابلہ کرسکے۔ وہ دن پیچھے رہ جانے والی اقوام کے لئے ماتم کا دن ہوگا۔ اس دن دنیا کے تمام ذلیل کام جن میں علم و ہنر کی ضرورت نہیں۔ ان کے سپرد کئے جائینگے اور تمام اعلیٰ کام ان لوگوں کے سپرد ہوں گے۔ جو انکے اہل ہیں۔

جب ہندوستانیوں کا انگریزوں سے واسطہ پڑا تھا۔ تو ہندوستانیوں کو دیکھنا چاہیئے تھا۔ کہ انگریزوں کی فوقیت کی اصل وجہ کیا ہے۔ اور انہی علوم کو حاصل کرنا چاہیئے تھا۔ جن سے اس ملک میں بھی وہی باتیں پیدا ہوں۔ جو انگلستان میں ہیں۔ ان کو ان علوم کی طرف رخ کرنا چاہیئے تھا۔ جن سے ملک میں دولت اور قوت پیدا ہو۔ محض قیاسی علوم بھی مفید تھے۔ ملک کی عقلی ترقی کے لئے ان کا سکھانا بھی لازم تھا۔ مگر صرف ان لوگوں کو جو ان کے اہل ہوں۔ اور جو انہیں سیکھ کر ان کا استعمال بھی کریں۔ اور ان میں ترقی کریں۔ ہندوستانیوں نے جن علوم کو یورپ سے لیا ہے۔ وہ انگریزی علم ادب ہے۔ کچھ تاریخ اور فلسفہ کچھ علوم سائنس ریاضی اور علم اقتصاد ہیں۔ یہی علوم یونیورسٹیوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔ اور یونیورسٹیاں ہی ملک کی ترقی کا دروازہ سمجھی جاتی ہیں۔ ان میں سے قریباً کل کے کل گریجوایٹ ملازمت اور وکالت کی طرف جاتے ہیں۔ یہ ملازمتیں سب اس قسم کی ہیں۔ جن میں انگریزی تحریر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جو اچھی ملازمت سے رہ جاتے ہیں۔ وہ معلمی کا پیشہ اختیار کرلیتے ہیں۔ تاکہ آئندہ نسل کو بھی اسی راستے پر چلائیں۔ جس پر کہ وہ خود چلے ہیں۔

اگر یہ سب طالب علم جو یونیورسٹیوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ ان علوم کو خالص محبت سے بھی پڑھیں۔ اور ان کا ارادہ ان علوم کو ترقی دینے کا بھی ہو۔ تو بھی یہ ایک عجیب نظارہ ہوگا۔ کہ تمام کا تمام ملک ان علوم کو حاصل کر رہا ہے۔ جن سے وہ روٹی پیدا کرنے کے قابل نہیں ہوں گے۔ بلکہ دوسروں سے روٹی مانگنے کے لائق ہونگے۔

اگر یہ تمام طالبعلم اس قابل ہوتے۔ کہ اعلیٰ تحقیقات کر سکتے۔ تو یہ بھی ایک بات تھی۔ کہ غیر ایک محتاج ملک ہے۔ جو اپنے لئے روٹی پیدا نہیں کر سکتا۔ اور جسمانی طور پر بھی ضعیف ہے۔ مگر تمام دنیا کو اپنی علمی ایجادات سے فیضیاب کر رہا ہے۔ مگر یہاں تو یہ کیفیت ہے۔ کہ علمی تحقیقات در کنار جو کچھ کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ اس کو بھی نہیں سمجھتے۔ اگرچہ یاد خوب کر لیتے ہیں۔ اور یہ غالباً کودن ہونے کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ ان قوموں کے ساز و سامان اور ان کی طاقت کے رعب کی وجہ سے ہے۔ جن کے علوم کو یہ پڑھتے ہیں ان کے دل میں یہ خیال ہی نہیں آسکتا۔ کہ ایسی طاقتور قومیں جو ایسے ایسے سامان بناتی ہیں۔ درحالیکہ ہم کچھ بھی نہیں بنا سکتے۔ کیا ان کی لکھی ہوئی باتیں غلط ہو سکتی ہیں۔ اور ان کے قائم کردہ اصولوں میں نقص ہو سکتا ہے۔ اس لئے ان اصولوں کو آمنا و صدقنا کہتے ہوئے تسلیم کر لیتے ہیں۔ اور سوچنے یا سمجھنے کا وقت ہی نہیں آتا۔ اگر سب لوگ ایسے نہ بھی ہوں۔ جیسا ہم نے بیان کیا ہے تو بھی ہم نہیں سمجھ سکتے۔ کہ کوئی ملک محض کتابی خوانوں کی امداد سے کس طرح اپنی ہستی اور عزت کو قائم رکھ سکتا ہے۔

دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں۔ کہ کسان کے پاس وہی ہل ہے جو ابتدا سے تھا۔ اور اس کے وہی طریقے ہیں۔ جو اس نے قدیم سے سیکھ رکھے ہیں۔ صناع اول تو یورپ کا سستا مال آنے کی وجہ سے رہے نہیں۔ اور جو باقی ہیں۔ وہ اپنے انہی ہتھیاروں

سے کام کرتے ہیں۔ ملک کی دولت پیدا کرنے والے تو یہی کسان اور صناع لوگ ہیں۔ جنہوں نے اپنے کام میں کوئی ترقی نہیں کی۔ اور کھانے والے وہ لوگ ہیں۔ جنہوں نے یونیورسٹیوں میں تعلیم پاکر یورپ کے عیش و عشرت کے تمام طریق سیکھے ہیں۔ یہ امر سبق آموز ہے۔ کہ وہ قلم جس کے ساتھ ہم لکھتے ہیں۔ وہ تو یورپ سے آتی ہے۔ مگر وہ ہل جس کے ساتھ دولت پیدا کی جاتی ہے۔ اسی قدیم وضع کا ہے۔ جہاں لکھنے کیلئے قلم پہلے زمانہ میں جنگل سے مفت کاٹ لیجاتی تھی۔ اب اسی کام کیلئے قلم آٹھ نو روپیہ کو ملتی ہے مگر جتنی پیداوار اس قدیم ہل سے پہلے زمانہ میں ہوتی تھی۔ اتنی ہی اب بھی ہوتی ہے۔ اگر تمام ملک کی مجموعی دولت میں ترقی ہوئی ہے۔ تو نہروں کی وجہ سے نیا ملک زیر کاشت آجانے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ مگر اس کام میں ہندوستانیوں کی کوشش کو دخل نہیں اور یا بمبئی اور دیگر شہروں کے چند کارخانوں کی وجہ سے ہمیں اس جگہ اس امر کو صاف طور پر بیان کر دینا چاہیئے۔ کہ جتنے لوگ وکالت معلمی سرکاری ملازمت محرری فوج یا پولیس کی ملازمت یا اسی قسم کی اور ملازمتیں کرتے ہیں۔ وہ ملک کی مجموعی دولت کو زیادہ نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ تاجر اور ٹھیکیدار جو گورنمنٹ کی عمارتیں بناتے ہیں۔ یا فوج کو رسد پہنچاتے ہیں۔ یا تمام اور قسم کے دکان دار جو باہر سے یا ملک کے اندر سے مال منگوا کر بیچتے ہیں۔ ان سب کا سہارا کاشتکار اور صناع کی پیداوار پر ہے۔ ان میں سے کوئی بھی ملک کی مجموعی دولت میں ایک حبہ کا اضافہ نہیں کرسکتا۔ وہ روپیہ جو یہ لوگ کماتے ہیں۔ خواہ وہ وکیل ہوں یا سرکاری عہدہ دار ہوں۔ یا ساہوکار اور سیٹھ ہوں۔ سب کاشتکار اور صناع کی کمائی میں سے آتا ہے۔ ان میں سے جو لوگ کاشتکار اور صناع کے لئے ضروری ہیں۔ مثلاً دکان دار جو کاشتکار اور صناع سے مال لیکر بیچیں تاکہ کاشتکار اپنا تمام وقت اپنی زمین کی ترقی میں خرچ کرسکے۔

اور صناع اپنی تمام توجہ اپنی صنعت کی خوبی کو بڑھانے پر لگا سکے۔ یہ لوگ بھی ملک کے لئے ضروری ہیں۔ اور اگرچہ یہ ملک کی مجموعی دولت میں اضافہ نہیں کر سکتے۔ مگر اس کو ہر حاجتمند تک پہنچانے میں امداد دیتے ہیں۔ سرکاری ملازم وکیل۔ پولیس اور فوج بھی اس حد تک مفید ہے۔ جس حد تک ملک میں امن قائم رکھنے کے لئے اور ملک کے اندر کمزور کو طاقتور سے بچانے کیلئے اور ملک سے باہر حملہ آوروں کے حملوں کو روکنے کے لئے ان کی ضرورت ہے۔ مگر چونکہ ان لوگوں کی خدمات کی ضرورت دولت پیدا کرنے کے لئے نہیں۔ بلکہ صرف دولت کی حفاظت کرنے کے لئے ہے۔ اس لئے اگر ان کی تعداد بہت زیادہ ہو جائے۔ یا ان کا معاوضہ بہت بڑھ جائے۔ تو دولت پیدا کرنے والے کے پاس کچھ نہیں رہیگا۔ اور اس کی غربت کا اثر تمام ملک پر پڑیگا۔ اور خود ان لوگوں پر پڑے گا۔ جنہوں نے اس کو اس کی پیدا کردہ دولت سے محروم کیا ہے۔ اگر لوگ سمجھدار ہوں۔ اور آپس میں فساد نہ کریں۔ اور ضرورت کے وقت باہر سے حملہ کرنے والے دشمن کے مقابلے کے لئے بھی تیار ہوں۔ تو نہ اتنی پولیس کی ضرورت رہیگی۔ نہ اتنے مجسٹریٹوں کی ضرورت ہوگی۔ نہ وکیلوں کی ضرورت ہوگی۔ اور نہ اتنی فوج کی ضرورت ہوگی۔ اور یہ تمام لوگ جواب وکالت۔ فوج پولیس یا سرکاری عہدوں پر مامور ہو کر ملک کی دولت کو کم کرا رہے ہیں۔ زراعت یا صنعت کے پیشوں میں داخل ہو کر ملک کی مجموعی دولت کو زیادہ کریں گے۔ اور تمام ملک آسودہ ہو جائیگا۔ اگر عام لوگ خرید و فروخت کے لئے زیادہ تر کام کو آپریٹو سٹورز سے لیں تو بہت سارے تاجر بھی جواب صرف چیزوں کی قیمت بڑھانے کی خدمت ادا کرتے ہیں۔ زراعت یا صنعت کے مفید کاموں پر لگ جائیں گے۔ مگر اس ملک کی نسبت کیا کہیں کہ جو اپنی ترقی کا ذریعہ بھی سمجھتا ہے۔ کہ ان اضافی پیشوں کو

بڑھایا جائے۔ اور اس کا نام وہ قومی ترقی رکھتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے ایک شخص اپنا مکان بنانے کیلئے مٹی کی بنیادیں رکھے۔ اور پہلی منزل بھی مٹی کی بنائے اور اس پر چھت جنگلی درختوں کی کمزور بے تراشی ہوئی شاخوں کی ڈالے۔ اور شاخوں پر سرکنڈہ ڈالے۔ مگر دوسری منزل کی دیواریں سنگ مرمر کی بنائے۔ اور فرش بھی سنگ مرمر کا لگائے۔ اور چھت پر بھاری بھاری گرڈر رکھے۔ اور اسی طرح کی چھ منزلیں بنا دے۔ اور یہ اوپر کی منزلیں نہ صرف بھاری اور بلند ہوں۔ بلکہ بنیادی منزل سے چاروں طرف بڑھی ہوئی بھی ہوں۔ اس کا صاف نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ تمام عمارت گر پڑے گی۔ اور اوپر کی منزلیں خواہ کتنی ہی مضبوط اور خوبصورت ہوں نہ وہ رہیں گی۔ اور نہ نیچے کی منزل رہیگی۔ یہی حال ہندوستان کا ہو رہا ہے۔ کہ کاشتکار اور صناع تو اپنے قدیم طریق پر ہیں۔ اور تعلیمی پیشوں میں تعداد دن بدن زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اور نہ صرف تعداد زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ بلکہ تنخواہیں بھی زیادہ ہوتی جاتی ہیں۔ اور اگر یہ سلسلہ قائم رہا تو ایک دن ملک کی تمام عمارت گر جائیگی۔ صحیح طریق عمارت بنانے کا اور پیشوں میں بھی یہ ہے۔ کہ نیچے کی منزل اوپر کی تمام منزلوں سے مضبوط ہونی چاہئے۔ یا ایک اور مثال ہے۔ جو ہندوستان کی حالت کو ظاہر کرتی ہے۔ فرض کیجئے۔ کہ ایک کسان ہے۔ جس کے پاس ایک سو بیگھہ زمین ہے۔ جس کی آمدنی ایک ہزار روپیہ سالانہ ہے۔ اس کسان نے اس زمین کے لئے ایک منشی ملازم رکھا ہے۔ جو حساب کتاب درست کرے ایک چوکیدار بھی رکھا ہے۔ جو کھیتوں کی حفاظت کرے۔ ایک وکیل ملازم رکھا ہے۔ جو اس کے مقدمات عدالت میں پیش کرے۔ ایک معلم ہے۔ جو اس کے لڑکوں کو تعلیم دے۔ اور اس گاؤں کے اکثر لوگوں کا کوئی پیشہ نہیں سوائے

اس کے کہ لکھنا پڑھنا سیکھ کر اس کے پاس ملازمت کریں۔ اور دن بدن ان ملازموں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ اور وقتاً فوقتاً یہ ملازم تنخواہ کی ترقی کے لئے بھی زمیندار کو تنگ کرتے رہتے ہیں۔ اور اس کو ان کی تنخواہیں بڑھانی بھی پڑتی ہیں۔ اور ان کے علاوہ پنڈت پروہت اور سادھو بھی ہیں۔ جن کا گزارہ زمیندار کی خیرات پر ہے۔ گداگر میراثی اور بھانڈ الگ ہیں۔ شادی بیاہ۔ مرنے پر بیسیوں قسم کے لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ خشک سالی ان سب کے علاوہ ہے۔ اور جن مصنوعہ چیزوں کی زمیندار کو ضرورت ہے۔ وہ یورپ سے آتی ہیں۔ اور ان کی قیمت میں بمبئی۔ دہلی امرتسر قصبہ اور گاؤں کے تاجر اپنا اپنا منافعہ دل کھول کر لگا لیتے ہیں۔ اور جب کبھی زمیندار غربت کی شکایت کرتا ہے۔ تو اس کے حساب کتاب کی نگرانی کے لئے ایک اور منشی مقرر کر دیا جاتا ہے۔ جس کی تنخواہ بھی اس کو دینی پڑتی ہے۔ اور اسے یہ سمجھایا جاتا ہے۔ کہ جتنے پڑھے لکھے آدمی یعنی منشی زیادہ ہوں گے۔ اور جتنی بڑی بڑی تنخواہیں ان کو دی جائیں گی اتنی ہی اس کی زمین کو ترقی ہوگی۔ مگر وہ حیران ہے۔ کہ سالانہ آمدنی تو وہی ہے۔ یہ ترقی کس طرح سے ہوگی۔ زمین جس سے غلہ نکلتا ہے۔ جس کو یہ منشی اور ساہوکار کھاتے ہیں۔ اس کی کاشت تو وہ اور اس کے بیٹے اسی باپ دادا کے ہل سے کرتے ہیں۔ جو اگرچہ بوسیدہ ہو گیا ہے۔ مگر ٹوٹا نہیں۔ اور وہ سالانہ پیداوار کو خود ناپتا ہے۔ کہ اس میں ایک دانے کی بھی زیادتی نہیں ہوئی۔ پھر یہ منشی اور ساہوکار زمین کی ترقی کہاں سے کریں گے۔ ہاں ان کے لئے بیشک یہ ترقی ہے۔ پہلے جو غلہ میرے پاس رہتا تھا۔ وہ اب یہ لے جاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اگر ہم کو نہ دوگے۔ تو تم سے چور لوٹ کر لے جائیں گے۔ میرے لئے چور اور یہ برابر ہیں۔ چور کو پکڑنے کی تو مجھے تدبیر بھی آتی ہے۔ مگر ان کو پکڑنے کی تدبیر

مجھے نہیں آتی۔ کیونکہ یہ لیتے تو ہیں۔ مگر میری خیر خواہی کی بات بھی کرتے ہیں۔ اور سچ ہے۔ کہ مجھے ان کو دیکھ کر شرم آجاتی ہے۔ کہ ایسے معتبر صورت آدمی کبھی جھوٹ بھی بول سکتے ہیں۔

اس زمیندار کے لئے اس سے اچھی تدبیر کیا ہو سکتی ہے۔ کہ تھوڑا بہت لکھنا پڑھنا اور حساب سیکھ کر تمام منشیوں کو برطرف کر دے زمین کی حفاظت بوقت ضرورت خود کرے۔ اپنے مقدمات کا اپنے زمیندار بھائیوں کے ساتھ بیٹھ کر دیانت داری سے خود فیصلہ کر لیا کرے۔ جو ضرورت کے سامان ہیں۔ ان کے لئے کاریگر منگوا کر اپنے ملک میں آباد کرے۔ تاکہ اس کو ہر مصنوعہ چیز سستی ملے۔ اور تمام منشیوں پنڈتوں۔ وکیلوں اور چوکیداروں کو کہے۔ کہ تم بھی میری طرح زمین کاشت کرو۔ یا میرے لئے کپڑے ہل۔ جوتے مشینیں بناؤ تاکہ ملک کی دولت بڑھے۔ اور سب لوگ آسودہ ہو جائیں۔ اور اگر تم نے اپنا رویہ نہ بدلا تو میں بھی تباہ ہونگا۔ اور تم بھی تباہ ہوگے۔

ہندوستان کی اس ابتر حالت کو لوگ اس وقت سے محسوس کر رہے ہیں۔ جب ۱۸۸۳ء کی تعلیمی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا۔ کہ اکثر لوگوں کی رائے ہے۔ کہ طالب علم محض یونیورسٹی کی تعلیم کی طرف جاتے ہیں۔ گورنمنٹ کا فرض ہے۔ کہ مختلف پیشوں کی تعلیم دے۔[1] اور غالباً اس سے پہلے بھی بہت لوگ محسوس کرتے ہوں گے۔ مگر جو رخ ایک مرتبہ لوگوں نے اختیار کر لیا ہے۔ اس میں تبدیلی نہیں ہو سکی۔ ۱۸۸۴ء میں سرکاری ملازمت کے لئے انگریزی تعلیم شرط قرار دے دی گئی۔ اور سرکاری ملازمتوں کی تنخواہیں بھی بہ نسبت اور پیشوں کے زیادہ رکھی گئیں۔ اس بات سے ہندوستانی دل میں وہ تحریک پیدا ہوئی۔ جو اب تک جاری ہے

---

[1] تعلیمی کمیشن ۱۸۸۳ء ص ۲۷۰

اور دن بدن اس کی قوت بڑھتی جاتی ہے۔ گویا کہ ہندوستانی مثل ایک بے جان گیند کے تھے۔ جس کو گورنمنٹ نے ایک بلندی پر سے نیچے لڑھکا دیا۔ اور اب وہ گیند محض کشش ثقل سے نیچے کی طرف چلا جاتا ہے۔ اور جتنا نیچے چلا جاتا ہے۔ اتنی ہی اس کی رفتار میں تیزی آتی جاتی ہے۔ چالیس برس اس کمیشن کی رپورٹ کو ہو گئے ہیں۔ چالیس برس میں جاپان بے کسی کی حالت سے نکل کر دنیا کی سب سے مال دار اور طاقت ور اقوام کا ہم پلہ بن گیا ہے۔ مگر ہندوستان باوجود دن رات کی کوشش کے اور بے انداز جلسوں اور تحریکوں کے ابھی تک پہلی منزل پر ہے۔ اور وجہ صرف یہ ہے۔ کہ ساری کوشش غلط سمت میں ہو رہی ہے۔ ۱۸۸۳ء کی کمیشن نے تجویز کی۔ کہ سکول کی جماعتوں کے دو فریق ہونے چاہئیں ایک تو وہ جو یونیورسٹی کے لئے تعلیم پائیں۔ اور دوسرے وہ جو عملی پیشوں کے لئے تیار ہوں۔ اس تجویز سے اگر گورنمنٹ کی منشاء نہ بھی ہوتی۔ تو ایسے لوگوں کے پیدا ہونے کی توقع تھی۔ جو ملک کے صنائع کو ترقی دیتے۔ خواہ ان سکولوں میں کیسی ہی ادنیٰ قسم کی صنعتوں کی تعلیم ہوتی۔ چونکہ شاگرد پڑھے لکھے ہوتے۔ ان میں سے ایسے بھی نکل آتے۔ جو صنعت میں حقیقی ترقی کر لیتے۔ مگر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے ۱۸۹۰ء میں الہ آباد میں یہ ریزولیوشن پاس کیا۔ کہ کوئی تبدیلی انگریزی تعلیمی مدارس و اسکول کی لٹریری خواندگی میں واسطے ترقی دینے ٹکنیکل ایجوکیشن کے نہیں ہونی چاہئے"[۵۲]

یہ ریزولیوشن سرسید نے پیش کیا۔ اور اس کی تائید میں ایک تقریر کی۔ جس میں سے کچھ اقتباسات ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔ جس سے مسلمانوں کے سب سے بڑے تعلیمی محرک کی زبان سے

---

۵۲ مجموعہ لکچرز سرسید احمد خان مرتبہ مولوی محمد امام الدین گجراتی ص ۲۹۶

معلوم ہوگا۔ کہ قومی تعلیم کے بارے میں ملک کا کیا خیال تھا۔ سر سید فرماتے ہیں۔ "اوّل میں اپنے ملک کے یونیورسٹی کے طالبعلموں کو گنوں گا۔ کہ کس قدر طالبعلم اے کورس میں تعلیم پاتے ہیں۔ اور کس قدر بی کورس میں۔ اگر میرا اندازہ صحیح ہو تو پانچ فیصدی سے زیادہ بی کورس میں پڑھنے والے نہ نکلیں گے۔ اور اس کے مقابلے میں پچانوے فی صدی اے کورس پڑھنے والے ہوں گے۔ اور یہ ایک نہایت روشن دلیل ہے۔ کہ ٹکنیکل ایجوکیشن کی وانٹ (مانگ) ملک میں نہیں ہے۔" ۵۳ یہ غلط خیال ضرور پیدا ہوتا ہے۔ کہ جب ٹکنیکل تعلیم یافتہ لوگ ہوں گے۔ تو کارخانے بھی قائم ہو جاویں گے۔ کیونکہ یہ خیال ایسی فلاسفی پر مبنی ہے۔ جیسے کوئی کہے۔ کہ مرغی پہلے تھی۔ یا مرغی کا انڈا مگر اس خیال کی غلطی اس سے ثابت ہے۔ کہ باوصف اس کے کہ مدت سے فزکس یونیورسٹی کی تعلیم میں داخل ہے۔ مگر اب تک کوئی بھی ٹکنیکل ایجوکیشن کا ماسٹر پیدا نہیں ہوا۔" ۵۴ سر سید کے اس خیال میں اتنی ترمیم کی ضرورت تھی۔ کہ فزکس کی اصولی تعلیم سے جو یونیورسٹی میں دی جاتی ہے۔ عملی صنعت کی قابلیت پیدا نہیں ہوتی۔ اور بہت سی صنعتیں ہیں۔ جن میں مہارت پیدا کرنے کے لئے باقاعدہ اُصولی تعلیم کی ضرورت نہیں۔ صرف ان اصولوں کے مطابق عملی طریقوں کا سیکھنا کافی ہے۔ سر سید فرماتے ہیں:" اس میں کچھ شبہ نہیں۔ کہ ہندوستان میں اور ہمارے صوبہ میں بھی انگریزی سرمایہ سے جدید کارخانے کلوں کے جاری ہوتے جاتے ہیں۔ اور بلا شبہ ان میں ہشیار مزدوروں اور فورمینوں کی ضرورت ہے۔ مگر یہ بات مشتبہ ہے۔ کہ کس قدر کی ضرورت ہے۔ آیا جواب مہیا ہو سکتے ہیں اس سے زیادہ کی اور آیا ان میں ہندوستانیوں کو بطور فورمین

---

۵۳ ایضاً ص ۳۹۹ ۵۴ ایضاً ص ۴۰۰

مقرر کرنے کی خواہش یا ضرورت ہے۔ اگر ہو تو بغیر اس کے موجودہ تعلیم یونیورسٹی میں یعنی اے کورس میں خواہ بی اے کلاس میں قائم ہو۔ انٹرمیڈایٹ میں یا انٹرنس میں یا مڈل میں کسی قسم کی تبدیلی ٹکنیکل ایجوکیشن کے لحاظ سے کی جاوے۔ کوئی ایسی تدبیر کرنی مناسب ہو گی۔ جس سے وہ ضرورت اگر ہے رفع ہو۔ بی کورس کی وہ کسی کلاس میں ہو۔ ہم اس لئے کچھ پرواہ نہیں کرتے۔ کہ ہماری رائے میں اس سے ملک کو کچھ فائدہ نہیں پہنچا ہے۔ اور نہ فائدہ پہنچنے کی توقع ہے۔"۵۵ تعجب ہے۔ کہ موجودہ کارخانوں کا ہندوستانی فورمینوں کے ہاتھ میں آجانا ملک کے لئے فائدہ مند نہیں سمجھا گیا۔ اور اس کے مقابلہ میں محض لٹریری تعلیم کو مفید سمجھا گیا۔ اگر اتنے فورمین ملک میں ہو جائیں۔ جو ملک کی ریلوے ورکشاپوں کو ہی سنبھال لیں۔ تو ملک ہندوستان کی تقویت اور فلاح کے لئے یہ عظیم الشان بات ہو گی اور واقعہ یہ ہے۔ کہ ایسی سب ضرورتوں کے لئے فورمین اب تک بھی باہر سے منگوائے جاتے ہیں۔ ۵۶ اگر ان ہندوستانی تعلیم یافتہ فورمینوں کو ریلوے میں جگہیں نہ ملتیں۔ تو جیسے سول سروس میں ہندوستانیوں کو لینے کے لئے شور و پکار ہوتی ہے۔ فورمینوں کے لئے شور و پکار بدرجہا مفید ہوتی۔ اپنی تقریر کے آخر میں سر سید فرماتے ہیں۔ یہ تجویز ایسی عمدہ ہے۔ کہ کوئی شخص اس کے عمدہ اور پسندیدہ ہونے سے انکار نہیں کر سکتا۔ ہم نہایت خوش ہیں۔ کہ ملک میں ٹکنیکل ایجوکیشن کی ترقی کے لئے جو مناسب تجویزیں ہوں۔ ان کو عمل میں لایا جائے۔ بشرطیکہ ہماری لٹریری تعلیم میں کچھ خلل واقعہ نہ ہو۔ اور ایسی کوئی تدبیر یا تبدیلی تعلیم میں نہ اختیار کی جاوے۔

---

۵۵ ایضاً ص ۲۰۰ ۵۶ دیکھو انڈین انڈسٹریل کمیشن رپورٹ سنہ ۱۹۱۸ء صفحہ ۷۰ و ص ۱۱۹

جو ہم کو برخلاف ہماری خواہشوں کے مجبور کر کے اعلیٰ درجہ
کی لٹریری تعلیم کی ترقی سے محروم کیا جائے" کاش کہ سرسید لٹریری
تعلیم پر اتنا زور نہ دیتے۔ اور مکینکل تعلیم جس کو وہ نہایت بے اعتنائی
سے دوسروں کے سپرد کر رہے ہیں۔ اس کا ذمہ خود اٹھاتے۔ اور
ملک کی حقیقی ترقی کی بنیاد ڈالتے۔ اور اگر لٹریری تعلیم کو وہ اپنے
حال پر بھی چھوڑ دیتے۔ تو کالج ہندوستان میں اتنے تھے۔ کہ لٹریری
تعلیم برابر ہوتی رہتی۔ اس بے رخی سے یہ نتیجہ پیدا ہوا۔ کہ ہندوستان
کے مسلمان جو سرسید کو تعلیمی رہنما سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنی
تمام ترقی کی خواہشوں کا مرکز لٹریری تعلیم کو قرار دیا۔ اور لٹریری
تعلیم کے لئے بالخصوص علیگڈھ کو اور جب اور صوبوں میں بھی مسلمانوں
میں ترقی کی خواہش پیدا ہوئی۔ تو انہوں نے سرسید کی تقلید
میں اسی قسم کے کالج بنانے شروع کئے۔ چنانچہ سب سے پہلے پنجاب
میں اسلامیہ کالج بنا۔ اور اس کے بعد پشاور میں صرف کثیر سے دوسرا
اسلامیہ کالج بنا۔ اور لکھنؤ میں شیعہ کالج بنا۔ اور غالباً بنگال میں بھی
ایک مسلمان کالج بنانے کی تجویز ہے۔ یہ سب کالج اسی قسم کے
لوگ پیدا کر رہے ہیں۔ جن کا ہم ذکر دولت کے خرچ کرنے والوں
میں کر رہے ہیں۔ اور جو کالجوں سے نکلتے ہی محتاجی کی عین تصویر
ہوتے ہیں۔ اور اس وقت تک غالباً ملک کے لئے زیادہ مفید ہوتے
ہیں۔ جب تک ان کو ملازمت نہیں ملتی۔ کیونکہ اس وقت تک
ان کا ملک پر بوجھ صرف اتنا ہوتا ہے۔ کہ وہ کھانا اور کپڑا لیتے ہیں
مگر جب ملازم ہو جاتے ہیں۔ تو بڑی بڑی تنخواہوں کے طلبگار ہوتے
ہیں۔ بغیر اس کے کہ ملک کی مجموعی دولت میں ایک حبہ بھی زیادہ کریں
اسی تحریک کی تکمیل کے لئے علیگڈھ کالج کو یونیورسٹی بنا دیا گیا
ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی مجموعی کوشش سے سب
سے بڑی رقم جو قومی کام کے لئے آج تک جمع کی ہے۔ وہ بھی تیس

لاکھ یا کچھ کم و بیش روپیہ ہے۔ جو مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے لئے جمع ہوا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی سب سے بڑی مالی کوشش کا مصرف یہ قرار دیا گیا ہے۔ کہ اس سے لٹریری علوم کی تعلیم دی جائے۔ خیال یہ ہے۔ کہ موجودہ کالج الہ آباد یونیورسٹی کے ساتھ ملحق ہونے کی وجہ سے ویسی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ جیسی کہ خود علیگڈھ میں یونیورسٹی بناکر ہوگی کیونکہ الہ آباد یونیورسٹی کو بہت سے کالجوں کا مساوی لحاظ کرکے امتحانوں اور تعلیم کے کورسوں کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ اور اگر علیگڈھ کالج کے پروفیسر کوئی نئی تحقیقات کریں۔ یا کوئی ایجاد کریں۔ تو ان کے طالب علم اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ کیونکہ دوسرے کالجوں کی استعداد کے بموجب کورس مقرر کرنا پڑتا ہے۔ یہ سوال اس وقت پیدا ہونا چاہئے تھا۔ جب ایسے محقق ہندوستانیوں میں سے پیدا ہو گئے ہوتے۔ اور ان کو شکایت ہوتی۔ کہ ان کی تحقیقاتوں سے فائدہ نہیں اٹھایا جاتا۔ اس لئے ایسی یونیورسٹی بنانی چاہئے۔ جس میں وہی اپنے اختیار سے تعلیمی نصاب مقرر کریں۔ اور اگر ایسے آدمی موجود ہوتے۔ (افسوس کہ ایسے آدمی نہیں ہیں) تو ان کے لئے بڑے بڑے دفتر بنانے کی اور رجسٹراروں اور سب رجسٹراروں پر روپیہ ضائع کرنیکی بھی ضرورت نہ ہوتی۔ اگر وہ کوئی علمی تحقیقات کرتے تو لازماً ان کے طالبعلم ان کی تحقیقات سے فائدہ اٹھاتے۔ خواہ وہ نئی قسم کی یونیورسٹی میں ہوتے۔ یا پرانی قسم کی یونیورسٹی میں اور خواہ گورنمنٹ کی چارٹر یافتہ یونیورسٹی ہوتی۔ یا ایک ٹوٹا پھوٹا مکتب ہوتا۔ قوم کے لئے لازم تھا۔ کہ ایسے آدمیوں کی خاص طور پر قدر کرتی۔ اور ان کے لئے سامان مہیا کرتی۔ جو ان کی تحقیقات کے لئے ضروری ہوں۔ اور جو طالبعلم ان کے علوم سے فائدہ اٹھانا چاہتے اور حقیقی علم کی طلب رکھتے ان کے لئے تعلیم کا انتظام کرتی۔ ایسے طالب علموں کے لئے ایسے پروفیسروں کی دو سطریں لکھی ہوئیں

کافی سند تھی۔ اور اس سے بھی بڑھ کر جو علمی کام وہ خود کرتے وہ اصلی سند ہوتا۔ مگر سرکاری ملازمت اور منشی گیری کرنے والوں کے لئے ایک کثیر رقم خرچ کرکے وائس چانسلر اور رجسٹرار اور سب رجسٹرار مقرر کرنا ایک عبث کام ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ کہ کیلنڈر چھاپنے سے یا وائس چانسلر مقرر کرنے سے یا گون (علمی جبہ) پہنانے سے کوئی محقق پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ تحقیق کا شوق اور اس کی قابلیت ایک خاص وہبی امر ہے۔ جو چند انسانوں کو حاصل ہوتا ہے۔ اور ان سے کم درجہ کے لوگوں کو ان کی صحبت سے یہ شوق پیدا ہوتا ہے۔ ایک حقیقی یونیورسٹی کا اصل مقصد یہ ہونا چاہئے۔ کہ اس قسم کے آدمیوں کو مہیا کرلے۔ تاکہ نوجوان ان کی صحبت میں رہ کر ان کے رنگ میں رنگین ہو جائیں۔ علم طبعیات اور کیمسٹری کی تحقیقات کے لئے علاوہ محققوں کے وجود کے ملک میں کارخانہ جات کا ہونا ضروری ہے۔ جن سے عملی صنعتوں میں ترمیم و اصلاح کرنے کا خیال ہر وقت مدنظر رہتا ہے۔ اور کامیابی ہونے پر جو مالی فوائد مدنظر ہوتے ہیں۔ وہ زبردست محرک کا کام دیتے ہیں۔ کارخانوں کے ہونے سے کارخانہ داروں کی مشکلات کا محققوں کو پتہ لگتا رہتا ہے۔ ان کے حل کے لئے کارخانہ دار انعام کے وعدے بھی کرتے ہیں۔ اور اس طرح سے طبعی تحقیق کی رہنمائی کرتے ہیں۔ گویا محققین کے سامنے سوالات پیش کرتے رہتے ہیں۔ جن کا جواب ایک نئی بات یا ایجاد ہوتی ہے۔ یورپ کی بہت سی طبعی تحقیقاتیں اسی طریق پر ہوئی ہیں۔ اور جب ایک مرتبہ یہ سلسلہ شروع ہو جائے۔ تو خود بخود طبایع میں سوالات پیدا ہونا کوئی مشکل امر نہیں۔ اس طریق سے ملک کی صنعتوں کو کارخانوں کے ذریعہ سے ترقی دینے سے طبیعیات کی تحقیقات کو زیادہ ترقی ہوگی۔ اور یہی اصل مقصود یونیورسٹیوں کا ہونا چاہئے۔ جیسے کہ مسلم یونیورسٹی ہے۔ جو اس دوسرے طریق سے بدرجہ احسن حاصل ہو سکتا ہے

مگر موجودہ صورت میں جب محقق اپنی قوم میں بھی موجود نہیں۔ اور غیر قوم کے محقق اس ملک میں آنے کے لئے تیار نہیں۔ اس غرض کے لئے زر کثیر کا صرف کرنا کہ ملک میں محقق پیدا ہوں۔ ایک لاحاصل کام ہے۔ جس میں ناکامی ہوگی۔ ایسے لوگ جو خود محقق نہیں۔ وہ دوسروں کو محقق کس طرح بنائیں گے۔ اگر مسلمانوں کی قوم اس قابل ہوتی۔ کہ اس نے صنعتی ترقی پر اب تک دس پندرہ کروڑ روپیہ خرچ کیا ہوتا۔ تو ہم اس تیس لاکھ روپے کے خرچ کا افسوس نہ کرتے جو یونیورسٹی پر خرچ ہونے کے لئے جمع ہوا ہے۔ مگر جب صنعتی تعلیم پر ایک حبہ بھی خرچ نہیں ہوا۔ تو انگریزی زبان اور معمولی علوم کے پڑھانے کیلئے جو اس وقت بھی پڑھائے جا رہے ہیں۔ قوم پر بوجھ ڈالنا قوم کی ترقی کو روکنا ہے۔ مسلمانوں کی قوم اس قابل نہیں کہ اتنا ہی روپیہ صنعتی تعلیم کے لئے بھی جمع کر سکے۔ اگرچہ صنعتی تعلیم کے لئے اس سے دس بیس گنا روپے کی ضرورت ہے۔ خدا کرے۔ کہ میرا اندازہ غلط ہو۔ اور مسلمان واقعی اس سے دس بیس گنا روپیہ ملک کی حقیقی ترقی کیلئے بھی جمع کر سکیں مگر ابھی تک رخ ادھر معلوم نہیں ہوتا۔ اور ڈر ہے۔ کہ جیسے مسلم یونیورسٹی ہندو یونیورسٹی لکھنؤ یونیورسٹی قائم ہوئی ہے۔ اور لوگ خواہش کر رہے ہیں۔ کہ آگرہ یونیورسٹی بھی ہو۔ اسی طرح اور یونیورسٹیاں بھی قائم کردی جائیں۔ ہمیں ہرگز اعتراض نہیں ہے۔ کہ جہاں کہیں بھی لائق اساتذہ ہیں۔ وہ اپنے طالب علموں کو اپنے اختیار سے ڈگریاں دے دیا کریں۔ اور ایسے کالج یونیورسٹیاں شمار ہوں۔ ہم خود یونیورسٹی کے مطلق العنان افسروں کی پابندیوں سے تنگ ہیں۔ مگر ہندوستان میں یونیورسٹی کے لوازمات میں سے یہ بھی سمجھا جاتا ہے۔ کہ بڑی بڑی شاندار عمارتیں ہوں۔ ریشمی جُبے ہوں۔ بڑے بڑے وائس چانسلر ہوں۔ غرضیکہ اینٹ پتھر پر قومی

سرمایہ خرچ ہو جائے۔ ہم ایسی ہر ایک نئی یونیورسٹی کے مخالف ہیں۔ یونی ورسٹی کے لیئے ایک شرط ہونی چاہیئے۔ اور وہ یہ کہ معلم عالم اور محقق ہوں۔ اگر ایسے شخص موجود ہوں۔ تو یونیورسٹی بننی چاہیئے اور اگر ایسے آدمی نہ موجود ہوں۔ تو خواہ فلک نما عمارات بھی موجود ہوں۔ اس کو یونیورسٹی کا نام نہیں دینا چاہیئے۔ کارلائل نے ایک جگہ کیا اچھا کہا ہے۔ کہ اگر میں ایک کمرہ کرایہ پر لے کر لیکچر دینا شروع کر دوں۔ تو وہی یونیورسٹی بن جائیگی۔

ہمیں یہ الزام دیا جائے گا۔ کہ ہم نے نئی یونیورسٹی کے ایک پہلو کو نظر انداز کیا ہے۔ یعنی یہ کہ یہ یونیورسٹیاں نہ صرف علوم کی تخلیق اور اشاعت کا ذریعہ ہوں گی۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ان کا اثر قومی اخلاق پر ہوگا۔ اسی لیئے یہ یونیورسٹیاں رہائشی یونیورسٹیاں کہلائیں گی۔ یعنی تمام طالبعلموں کے لیئے ضروری ہوگا۔ کہ یونیورسٹی کے ہاسٹل میں مل کر رہیں۔ اور یہ ایک ایسا فائدہ ہے۔ کہ بغیر ان کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ سرسید کا علیگڈھ کالج کو رہائشی کالج بنانے میں بھی منشاء تھا۔ آپ نے ایک لکچر میں جو ۱۸۹۷ء میں شاہجہانپور میں دیا۔ یہ فرمایا "پس ہم کو مسلمانوں کے لیئے تعلیم سے زیادہ وہ چیز کرنی ہے۔ جس کو ہم تربیت کہتے ہیں۔ اور جو قوم کو قوم بننے کے لیئے ایسی ہے۔ جیسے جان بدن کیلئے اور بغیر اس کے قوم کا قوم بننا اور زندہ قوم بننا محالات سے ہے۔ اس مطلب کے لیئے ہم کو کیا کرنا ہے۔ اوّل ہمارا کام یہ ہونا چاہیئے۔ کہ قوم کے بچوں نوجوانوں کو جس قدر ہو سکے۔ ہم ایک جگہ جمع کریں۔ وہ ساتھ رہیں ایک جگہ پڑھیں۔ ایک جگہ کھائیں۔ ایک جگہ سوئیں۔ ایک جگہ کھیلیں ایک جگہ ہنسیں۔ ایک جگہ مریں۔ اسی کے ساتھ ان کی تربیت کا کافی سامان مہیا کریں" اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ ہندوستان کو قومی اخلاق پیدا کرنے کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ اور اتنی ہی

بڑی ضرورت ہے۔ جتنی مادی سامان مہیا کرنے کی۔ کالجوں اور سکولوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں کے اخلاق پر بہت کچھ اثر ڈالا جا سکتا ہے۔ بالخصوص ان پر جو ایک ساتھ مل کر ہاسٹلوں میں رہتے ہیں۔ مگر وہ اخلاق کیا ہیں۔ جن کی قومی ترقی کے لیئے ضرورت ہے اس سوال کا جواب ہر شخص اپنی سمجھ کے مطابق دے گا۔ اور اسی خیال کے مطابق وہ لڑکوں پر اثر ڈالنے کی کوشش کرے گا۔ ہو سکتا ہے۔ کہ بعض اشخاص یا بعض حالات کے ماتحت ایسے اخلاق پیدا ہوں۔ جو بجائے قومی ترقی کے قومی تنزل کا موجب ہوں۔ یا کم از کم ان کی وجہ سے قومی ترقی ایسی سمت میں ہو۔ جو ترقی کی صحیح سمت نہ ہو۔ اگر علوم کی طرح اخلاق بھی یورپ سے ہی لیئے جائیں۔ اور وہ بھی دو قسم کے ہیں۔ اور بہت کم لوگ ان دو اقسام میں تمیز کرتے ہیں۔ بعض کے تو کل مداح ہیں۔ اور اخذ کرتے ہوئے غیر ضروری کو لے لیتے ہیں۔ اور ضروری ان کی نظر سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اور بعض تمام یورپین اخلاق کو مذموم قرار دے کر سب کو رد کر دیتے ہیں۔ پہلی قسم ان اخلاق کی ہے۔ جن کا ظہور کھانے کے کمرے اور ملاقات کے کمرے میں ہوتا ہے۔ ان میں لباس پہننے کا طریق۔ کھانا کھانے کا طریق۔ مزاج پرسی کا طریق۔ انگریزی زبان میں ہنسی مذاق اور مجلسی گفتگو کرنے کا طریق شامل ہیں۔ ہندوستان میں بہت سے رہائشی کالجوں کا اخلاقی مقصود بھی صفات پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اور بعض لوگ اس بات کے ایسے دلدادہ ہوتے ہیں۔ کہ وہ بچپن ہی سے اپنی اولاد کو ولایت میں تعلیم دیتے ہیں۔ تاکہ ان میں یہ اخلاق بطریق احسن سرایت کر جائیں۔ اور تاکہ ان کے انگریزی تلفظ سے یہ معلوم نہ ہو۔ کہ وہ غیر انگریز ہیں۔ چنانچہ میں نے دو ہندوستانی نوجوانوں کو دیکھا۔ جن کے ماں اور باپ دونو ہندوستانی تھے۔ مگر وہ ایسی چھوٹی عمر میں ولایت بھیجے

گئے تھے۔ کہ ان میں سے ایک کو تو چند الفاظ ہندوستانی زبان کے آتے تھے۔ مگر دوسرا بالکل نہیں سمجھتا تھا۔ بڑا لڑکا اردو زبان کے حروف تہجی پہچان سکتا تھا۔ اور فقط اسی قدر مگر چھوٹا لڑکا حروف تہجی بھی نہیں پہچان سکتا تھا۔ بڑے کی عمر قریباً اٹھارہ برس کی ہوگی۔ اور چھوٹے کی قریباً ۱۶ برس۔ اس انگریزی تلفظ کا یہاں تک خیال کیا جاتا ہے۔ کہ پنجاب یونیورسٹی نے انگلستان سے ایک پروفیسر کئی ہزار روپے کے خرچ پر صرف اسی غرض کے لئے بلایا تھا۔ کہ وہ یونیورسٹی کو مشورہ دے۔ کہ ہندوستانی کس طرح انگریزی زبان میں مشاقی پیدا کر سکتے ہیں۔ اور بالخصوص تلفظ کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ اور یہ ہندوستان ہی میں نہیں۔ بلکہ عموماً ناتربیت یافتہ اقوام جن کو اپنے حقیقی نفع اور ضرر کا قومی احساس نہیں۔ وہ مہذب بننے کی یہی آسان راہ اختیار کرتی ہیں۔ اور حقیقت میں کسی ایک فرد کے لئے یورپین مجالس میں شامل ہونے کے لئے یہی باتیں پروانہ راہداری کا کام دیتی ہیں۔ مگر قوم ان تمام باتوں کو حاصل کرنے کے بعد بھی ذلت سے نہیں نکل سکتی۔

دوسری قسم کے وہ اخلاق ہیں۔ جن کا ظہور کارخانوں میں ہوتا ہے۔ اور جن سے یورپ میں آسودگی اور قوت پیدا ہوئی ہے۔ یہ وہ اخلاق ہیں۔ جن سے یورپ ممتاز ہوا ہے۔ اور انہی کا حصول ہندوستان کی دلی تمناؤں کو بھی پورا کر سکتا ہے۔ ان میں سے سب سے اول تو ایک خاص مقصود کا دل میں استحکام ہے۔ اور ایسا استحکام کہ زمین و آسمان ٹل جائیں۔ مگر وہ دل سے نہ نکلے اس کے بعد محنت شعاری ہے۔ ہر شخص روزانہ اپنی پوری قوت اور پورے دل کے ساتھ محنت کرے۔ اور اپنے مقصود کے حاصل کرنے کے لئے ادنیٰ سے ادنیٰ کام سے عار نہ ہو۔ محنت اور کام

کی محبت دل میں ہو۔ نہ کہ صرف روپے کی خاطر محنت کرے۔ تیسری صفت مل کر کام کرنے کی قابلیت ہے۔ اور اس کے لئے ضروری ہے۔ کہ ہر شخص اپنے ذاتی مفاد پر مشترک غرض کو مقدم رکھے۔ اور اپنے مقرر کردہ افسروں کی کامل اطاعت بے چون وچرا کرے اور غلطی یا صواب میں ان کے کہنے پر چلے۔ چوتھی صفت ایمانداری اور راستبازی ہے۔ کہ جماعت میں سے کوئی شخص ایک دوسرے کو دھوکا نہ دے۔ اور بالخصوص افسر اس عہد پر سچے ہوں۔ جو انہوں نے اپنے ماتحتوں کے ساتھ کیا ہے۔ اور ماتحت اس عہد میں سچے ہوں۔ جو انہوں نے اپنے افسروں کے ساتھ کیا ہے غرضیکہ دونوں فریقوں میں سے کوئی غدار نہ ہو۔ اور نہ روپے کے معاملے میں خائن ہو۔ پانچویں صفت طریق عمل ہے۔ جس کے یہ معنے ہیں کہ ہر کام کے کرنے کا ایک صحیح طریق ہوتا ہے۔ جس کا معلوم کرنا ضروری ہے۔ اور اسی کے مطابق کام کرنے سے کامیابی کی جلدی امید ہو سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ ہر مقصود کو حاصل کرنے کے لئے جو جو ممکن طریقے ہوں۔ ان کا تفصیلی مطالعہ کر کے جس طریق کو ترجیح دی جائے۔ اس کی تمام تفصیلات کا نقشہ عمل کرنے سے پہلے مرتب کر لینا چاہیئے۔ اور اسی کے مطابق کام کرنا چاہیئے۔ اتفاقات پر حتی الوسع کسی بات کو نہیں چھوڑنا چاہیئے یہ خلق یا عادت خاص اس زمانے کی ایجاد ہے۔ اور جب اقوام باقی صفات میں مساوی ہوں۔ تو کامیابی اس کے حصے میں آتی ہے۔ جس کا طریق عمل فوقیت رکھتا ہو۔ چھٹی صفت دلاوری ہے جس کے معنے یہ ہیں۔ کہ مقصود کے حصول کے راستے میں اگر روک ہو۔ تو اس روک کو دور کرنے کے لئے اپنی پوری قوت سے کام کرے۔ اور اگر اس کو دور کرنے کے لئے جان دینے کی ضرورت ہو۔ تو دریغ نہ کرے۔ یہ صفات ہیں۔ جو یورپ کی

حقیقی زندگی میں پائی جاتی ہیں۔ ان صفات کا ظہور ملاقات کے کمروں میں نہیں ہوتا۔ بلکہ کارخانوں میں ہوتا ہے۔ جہاں ہزاروں آدمی ملک کی آسودگی کے لئے محنت کرتے ہیں۔ یا میدان جنگ میں ہوتا ہے جہاں قوم کی قوم اپنے مقصود اعظم کی حفاظت کیلئے اپنے افسروں کے حکم کے ماتحت اپنی پوری قوت اور ہستی کو خرچ کر دیتی ہے۔

اگر قوم کے لئے اخلاق کی ضرورت ہے۔ تو ان اخلاق کی ضرورت ہے۔ کالجوں کے ہاسٹلوں میں ان اخلاق کے پیدا ہونے کی توقع نہیں ہے۔ کیونکہ ان جگہوں میں عموماً وہ اثرات نہیں ہیں۔ جو یہ اخلاق پیدا کریں۔ بلکہ اکثر دیکھا گیا ہے۔ کہ صرف ملاقات کے کمرے کے نمائشی اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔ جو قوم کے لئے بوجہ حقیقی اخلاق نہ ہونے کے مضر ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ جس شخص میں دوسرے اخلاق نہ ہوں گے۔ وہ انہی اخلاق کو حقیقی سمجھ کر اپنا زندگی کا مقصود بھی قرار دے گا۔ کہ وہ نشست گاہ کی زینت بنے۔ ان حقیقی اخلاق کو پیدا کرنے کے لئے انجمنیں اور کلبیں (مجالس تفریحی) زیادہ مفید ہیں۔ بشرطیکہ ان کی بنیاد خلوص نیت سے ڈالی جائے۔ نہ کہ ذاتی اغراض کیلئے بہت سارے ہاسٹلوں کی غرض صرف یہی ہوتی ہے۔ کہ لڑکے سیاسی امور میں حصّہ نہ لیں۔ جب اخلاق بنانے والوں کی اغراض مختلف ہوں۔ اور ان کا خصوصی مقصد ایسے اخلاق پیدا کرنا نہ ہو۔ جو قوم کی ہستی کے لئے ضروری ہیں۔ تو ایسی رہائشی یونیورسٹیوں پر کروڑوں روپیہ خرچ کرنا قومی سرمایہ کو ضائع کرنا ہے۔ اس سے بہت کم خرچ پر ضروری اخلاقی تربیت کا انتظام ہو سکتا ہے۔

شاید بعض لوگ یہ خیال کریں۔ کہ ہم نے قومی رخ کا صحیح نقشہ نہیں کھینچا۔ اور قوم صنعت کے حاصل کرنے کی طرف ایسی غیر متوجہ نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ اس لئے ہم ضروری سمجھتے

ہیں۔ کہ قبل اس کے کہ اس حصہ مضمون کو ختم کریں۔ چند شہادات پیش کریں۔ جن سے ثابت ہو سکے۔ کہ قومی رخ کس طرف کو ہے۔ انڈسٹریل کمیشن ۱۸-۱۹۱۶ء لکھتی ہے "انیسویں صدی میں تجارت اور صنعت کے بارے میں گورنمنٹ کی پالیسی عدم مداخلت تھی۔ اور ملک کے مادی ذرائع کو بڑھانے میں اس کی کوشش صرف ریلوں اور نہروں تک محدود رہی۔ سوائے بمبئی کے موجودہ زمانے کے صنعتی طریقوں کا اجرا صرف یورپین لوگوں نے کیا۔ ہندوستانیوں کیلئے تجربہ حاصل کرنے کے مواقع کم تھے۔ اور صنعتی تعلیم کیلئے بھی قریباً صدی کے اختتام تک کوئی کوشش نہیں ہوئی۔ اور بعد میں بھی ناکافی پیمانہ پر ہوئی۔ ہندوستانیوں کے لئے صنعتی کاموں کی تعلیم نہ ہونے کے سبب سے یورپ سے کاریگر لائے گئے۔ جنہوں نے اپنی نگرانی میں ان پڑھ مزدوروں کو سکھا کر کارخانے جاری کئے۔ اس قسم کے مزدوروں میں سے ایسے آدمیوں کا پیدا ہونا جو نگرانی کا کام کر سکیں۔ ناممکن ہے"۵۷ انگلستان اور بنگال کی آبادی قریباً مساوی ہے۔ یعنی ساڑھے چار کروڑ۔ اور ایک عجیب اتفاق ہے۔ کہ دونوں ملکوں میں جو طالبعلم ڈگری کیلئے تعلیم پا رہے ہیں۔ وہ بھی مساوی ہیں۔ یعنی چھبیس ہزار۔ انگلستان کی اس تعداد میں تمام ممالک کے طالبعلم شامل ہیں اور ان میں ہندوستان کے بھی۔ مگر بنگال میں صرف یہیں کے ہیں۔ انگلستان میں ان میں سے بہت سی لڑکیاں بھی ہیں۔ مگر بنگال میں لڑکیوں کی تعداد بہت ہی قلیل ہے۔ انگلستان میں ان میں سے بہت بڑا حصہ طالبعلموں کا پیشہ وری کی تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ مثلاً طب۔ قانون۔ دینیات۔ معلمی۔ انجینئرنگ اور صنعتی علوم۔ بنگال میں اگرچہ قانون کے طالب علموں کی تعداد بہت

---

۵۷ انڈسٹریل کمیشن رپورٹ ۱۹۱۸ء ص ۱۰۵

زیادہ ہے۔ مگر ڈاکٹری کے طالب علموں کی تعداد انگلستان کی نسبت بہت کم ہے۔ اور انجینئرنگ کے طالب علم بالکل ہی کم ہیں۔ دینیات یونیورسٹی میں پڑھائی نہیں جاتی۔ معلمی کے طالب علم بہت ہی تھوڑے ہیں۔ اور ابھی تک کوئی صنعتی علوم کے طالب علم نہیں ہیں۔ کیونکہ بنگال کی صنعتیں حالت طفولیت میں ہیں۔ اور تمام ماہر انگلستان سے آتے ہیں۔ اس چھبیس ہزار میں سے بائیس ہزار صرف علم ادب کے نصاب کی تعلیم پاتے ہیں۔ جس سے وہ سوائے کلرکی معلمی یا قانون کے اور کسی کام کے قابل نہیں ہوتے۔ انگلستان میں اگر معلمی کو بھی پیشوں میں داخل کیا جائے۔ تو قریباً بائیس ہزار پیشوں کی تعلیم حاصل کرتے ہوں گے۔ اور صرف چار ہزار علم ادب کی۔ اس میں اتنا خیال رکھنا چاہئے۔ کہ ہندوستان کی انٹرمیڈایٹ کی تعلیم انگلستان کے میٹری کولیشن کے برابر ہے۔ اس لحاظ سے ان چھبیس ہزار میں سے صرف گیارہ ہزار کو یونیورسٹی کا طالبعلم سمجھنا چاہئے۔ اگر گیارہ ہزار بھی سمجھیں۔ تو بھی ایک بہت کثیر تعداد کو محض علم ادب کی تعلیم دی جارہی ہے۔" ۵۸

"۱۹۱۹-۱۹۲۰ء میں تمام ہندوستان میں علمی کالجوں کی تعداد ۲۱۶ تھی۔ ہائی سکول ۲۱۱۳ مڈل سکول ۷۵۹۵ اور پرائمری سکول ۱۵۵۳۴۴ تھے۔ کالجوں میں طالبعلموں کی تعداد ۶۵۹۱۶ تھی۔ ہائی اور مڈل سکولوں میں ۱۲۸۱۸۱۰ اور پرائمری سکولوں میں ۶۱۳۳۵۲۱ تھی۔ اور کل خرچ ۱۴۸۸۹۶۹۶۰ (چودہ کروڑ) روپے تھا۔ اس کے مقابلے میں کاروباری اور صنعتی سکولوں کی تعداد ۲۶۹ تھی۔ اور طالبعلموں کی تعداد ۱۲۹۳۵ تھی۔ ان میں سے ۳۰۹۰ عورتیں ہیں۔ جو معمولی قسم کی دستکاریاں سیکھتی ہیں

---

۵۸ کلکتہ یونیورسٹی کمیشن رپورٹ ۱۹۱۹ء جلد اوّل ص ۱۹-۲۰-۲۲

اور باقی ۹۸۴۵ مرد ہیں۔ ان میں سے ۱۵۲۹ عیسائی ہیں۔ جو مشنری سکولوں میں بڑھئی۔ لوہار۔ اور جولاہے کا کام سیکھتے ہیں۔ ان کی غرض یہ ہے۔ کہ جو ادنیٰ ذات کے لوگ عیسائی ہو جاتے ہیں۔ ان کے لئے روزی کمانے کا ذریعہ ہو جائے۔ باقی ۸۳۱۶ میں سے ۴۵۲۷ ہندو ہیں۔ اور ۲۶۳۶ مسلمان اور باقی بدھ پارسی وغیرہ"۔ ۵۹ ان سکولوں میں سے اکثر میں وہی پیشے سکھائے جاتے ہیں۔ جن کو عموماً اس ملک کے لوگ پہلے سے جانتے ہیں۔ ادا کرتے ہیں۔ مثلاً موٹا کپڑا بننا میز رسی بنانا لوہار کا کام درزی کا کام وغیرہ البتہ کچھ اوزاروں اور بنانے میں قدرے ترمیم اور ترقی ضرور ہے۔ مثلاً کپڑا بننے کے لئے پرانی کھڈی کے ترمیم شدہ دستی کھڈی فلائینگ شٹل والی استعمال کرتے ہیں۔ وہ ٹیکنیکل سکول جن میں موجودہ زمانے کی ضرورت کے مطابق مشینیں چلانے کا کام لیا جاتا ہے۔ تعداد میں کم ہیں۔ چار گورنمنٹ انجینئرنگ کالجوں میں میکنکل اور الیکٹریکل انجینئرنگ کی شاخیں کھولی گئی ہیں۔ جو اعلیٰ درجہ کا کام سکھاتی ہیں۔ یہ کالج مدراس سیب پور کلکتہ۔ رڑکی اور پونہ میں ہیں۔ ان کے علاوہ وکٹوریا جبلی ٹکنیکل انسٹیٹیوٹ بمبئی میں میکنکل انجینئرنگ۔ الیکٹریکل انجینئرنگ عملی کیمسٹری مشینوں پر کپڑا بننا اور حفظان صحت کی انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی قابل ذکر سر جے جے سکول آف آرٹ بمبئی ہے۔ جس میں چینی کے برتن موجودہ طرز پر بنانے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ لکھنؤ کا ٹکنیکل سکول ہے۔ سیرام پور میں ہاتھ سے کپڑا بننے کی تعلیم دی جاتی

---

۵۹ ان اعداد کے لئے دیکھو۔ تعلیمی رپورٹ گورنمنٹ ہند بابت سال ۲۲-۱۹۱۷ء مرتبہ جے۔ اے رچی صاحب ایجوکیشنل کمشنر۔

ہے۔ مدراس میں چمڑا رنگنے کا سکول ہے۔ ان کے علاوہ مدراس بمبئی۔ کلکتہ۔ لکھنؤ اور لاہور میں آرٹ سکول ہیں۔ جن میں نقاشی نجّاری اور خوبصورت پھول بوٹے کا کام مکانوں کی آرائش کے لیے سکھایا جاتا ہے۔ ۱۹۱۷ء میں اس قسم کے تمام صنعتی اور کاروباری سکولوں اور کالجوں کی تعداد ۱۵۸۷ تھی۔ گویا چار برس میں تعداد ۱۸ بڑھ گئی ہے۔ ۱۹۱۷ء میں ان سب کا خرچ ۱۴۷۰۲۵۱ (چودہ لاکھ) روپے تھا"[۱] اب اس سے کچھ تھوڑا زیادہ ہوگا۔ گویا کتابی علوم پر خرچ قریباً پندرہ کروڑ تھا۔ اور صنعتی علوم پر معمولی کام درزی اور نجاری کے شامل کرکے بھی پندرہ لاکھ سے کم ہے اور اگر صرف نئے کاموں کو دیکھا جائے۔ جن کی ملک کو ضرورت ہے اور جو کام خود ملک کے پرانے کاریگر نہیں سکھا سکتے۔ تو ان پر خرچ شاید اس سے نصف یا تیسرا حصّہ ہو۔ اس پندرہ کروڑ میں سے چار کروڑ سیکنڈری سکولوں پر خرچ ہوا ہے۔ اور چار کروڑ پرائمری سکولوں پر اس وقت ان سیکنڈری و پرائمری سکولوں کا خرچ محض کتابی پیشوں کی خاطر ہو رہا ہے۔ لیکن اگر ملک میں صنعتی تعلیم کے کافی ذرایع بہم پہنچ جائیں۔ تو اس میں ایک حصّہ ان طالبعلموں پر بھی خرچ ہوگا۔ جن کا مقصد عملی علوم سیکھنا ہے۔ مسٹر ایچ شارپ ایجوکیشنل سکرٹری گورنمنٹ آف انڈیا کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ کتابی تعلیم پر اتنا روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ کہ صنعتی تعلیم کے لیے زیادہ نہیں بچ سکتا۔ چنانچہ وہ ۱۹۱۷ء کی پنجسالہ رپورٹ کے ۱۵۵ صفحہ پر لکھتے ہیں :۔ "عام مطالبہ یہ ہے۔ کہ صنعتی تعلیم پر زیادہ خرچ ہو۔ مگر ایسی تجاویز یا تو مکمل نہیں ہوتیں۔ اور اگر ہوتی ہیں۔ تو اساتذہ کے مہیا کرنے کی یا دوسری بہت قسم کی دقتیں پیش

---

[۱] ساتویں پنجسالہ تعلیمی رپورٹ بابت ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۷ء مرتبہ ایچ شارپ صاحب جلد اوّل ص ۱۴۸

آجاتی ہیں۔ کتابی علوم کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم کے لئے برابر شور و پکار ہے۔ اور اس کا پورا کرنا نسبتاً آسان ہے۔ سکولوں اور کالجوں کی روز افزوں تعداد کا سیلاب اس تمام روپے کو بہالے جاتا ہے جو صنعتی تعلیم کے لئے خرچ کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے اس مطلب کے لئے بڑی رقوم خرچ کرنے میں تامل پیدا ہوتا ہے۔ خصوصاً عوام الناس کی ابتدائی تعلیم کے خیال سے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ پرائمری تعلیم بھی صنعتی تعلیم کے راستے میں روک ہے۔ پرائمری تعلیم کو حتی الوسع لازمی کرنے کی قرار داد پاس ہو چکی ہے۔ اور غالباً اس کو وسیع کرنے پر دن بدن زیادہ روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ ملک کی اصلی ضرورت کو دیکھا جائے۔ تو ایک لڑکے کو پرائمری تعلیم دینے کی بجائے اعلیٰ درجہ کے بوٹ بنانا چینی کے برتن بنانا۔ گیند بنانا وغیرہ ایسی چیزیں سکھانا مفید ہے اگر ایک لڑکے کے باپ کے پاس دو باتوں کے لئے روپیہ نہیں ہے۔ کہ اپنے بیٹے کو پرائمری تعلیم بھی دے۔ اور مفید پیشہ بھی سکھائے تو وہ پیشہ سکھانا پسند کرے گا۔ اور اس کی پرائمری تعلیم پر روپیہ خرچ کرنا پسند نہیں کرے گا۔ کیونکہ پرائمری پاس کرکے اس میں اور ایک انپڑھ مزدور میں روزی کمانے کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہوگا۔ اور اگر وہ پرائمری پاس ہونے کی وجہ سے محنت کرنے سے عار کرے۔ تو اس کے لئے فاقہ کشی کے سوائے اور کوئی نتیجہ نہیں ہوگا۔ برخلاف اس کے جب وہ کوئی پیشہ سیکھ لے گا۔ تو علاوہ آسودہ ہونے کے اس کا علم اور خلق بھی ترقی کرے گا۔ ایک موچی جو اعلیٰ درجہ کا بوٹ بنا سکتا ہے۔ یا ایک گیند ساز جو اعلیٰ درجہ کا گیند بنا سکتا ہے۔ یقیناً ایک محض پرائمری تک پڑھے ہوئے انسان سے جو اور کوئی پیشہ نہیں جانتا۔ علم ماہیت اشیاء میں بڑھ کر ہے۔ اور اس کے اخلاق میں آزادی اور خود مختاری

کی صفات بوجہ آسودہ حال ہونے کے پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور اس میں قومی احساس بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے ایک بے کار پرائمری پاس شدہ میں گداگی کی تمام رذیل صفات موجود ہوتی ہیں۔ اسی طرح اگر ملک کے سامنے دو راستے ہوں۔ ایک یہ کہ پرائمری تعلیم کو وسیع کیا جائے۔ اور تمام سرمایہ اسی پر خرچ کر دیا جائے۔ اور دوسرا یہ کہ حتی الوسع ہر شخص کو کوئی دستکاری سکھائی جائے۔ تو یقیناً یہ دوسرا راستہ ملک کی فلاح اور ترقی کے لئے زیادہ مفید ہوگا۔ محض لکھنے پڑھنے کو اتنی وقعت نہیں دینی چاہئے۔ جب اس لکھنے پڑھنے کا استعمال کرنے کی استطاعت نہ ہو اور اس کا استعمال یہی ہے۔ کہ اس سے کسی پیشہ کے سیکھنے میں مدد لی جائے۔ اس وقت بھی بہت سے پرائمری تک پڑھے ہوئے لوگ ہیں۔ جو ان پڑھ لوگوں سے کسی صورت میں کسی قسم کی فوقیت نہیں رکھتے۔ بلکہ بہت سے ان پڑھ کاروباری لوگ اپنے ہنر اور اور تجربہ کی وجہ سے ایسے کامیاب ہیں۔ کہ بہت سے اعلیٰ تعلیمیافتوں کے لئے باعث رشک ہیں۔ اور قومی اور ملکی معاملات کو خوب سمجھتے ہیں۔ اور اگرچہ کتاب نہیں پڑھ سکتے۔ مگر تجربہ کی کتاب کو خوب پڑھ سکتے ہیں۔ اور ایک رنگ مین محض کتابی لوگوں سے بہتر ہیں۔ کیونکہ وہ کتاب کو منبع علم نہیں سمجھتے۔ بلکہ تجربہ کو اور اصل حقیقت بھی یہی ہے۔

صنعتی کالجوں میں طلباء کی تعداد کا اندازہ وکٹوریا جبلی انسٹیٹیوٹ بمبئی کی مثال سے ہو سکتا ہے۔ جو غالباً سب سے بڑا صنعتی کالج ہے۔ ۱۳۱ رمارچ سنہ ۱۹۲۰ء کو اس میں کل طالبعلم ۸۳۳ تھے۔ مگر سال بھر میں حاضری کی ماہوار اوسط ۲۶۵ تھی۔[لہ] ہر سال

[لہ] دیکھو سالانہ رپورٹ وکٹوریا جبلی ٹکنکل انسٹیٹیوٹ بابت سنہ ۲۰-۱۹۱۹ء

قریباً ایک سو طالب علموں کے لئے گنجایش ہوتی ہے"۔ ۵۱۲ سر جے جے آرٹ سکول میں ہر سال کل ۱۵ طالب علم چینی کے برتن بنانے کا کام سیکھنے کیلئے لئے جا سکتے ہیں"۔ ۵۱۳ گورنمنٹ کے پانچ زراعتی کالجوں میں پہلی مارچ ۱۹۲۰ء کو ۶۲۰ طالبعلم تھے۔ اور اوسط ماہواری حاضری ۵۶۶ تھی۔ مگر معلوم ہوا ہے۔ کہ بجائے اس کے کہ اس علم سے جو انہوں نے حاصل کیا ہے۔ عملی فائدہ اٹھائیں۔ اکثر طالب علم گورنمنٹ کی انتظامی ملازمتیں۔ ضلع داری وغیرہ اختیار کر لیتے ہیں۔ صنعتی تعلیم کے لئے ۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۹ء تک گورنمنٹ ایک سو سے زیادہ وظائف یورپ میں طالب علم بھیجنے کے لئے دے چکی ہے۔ اس کے علاوہ بنگال کی انڈین ایسوسی ایشن کے وظائف سے جو ۱۹۰۴ء میں صنعتی تعلیم کی ترقی کے لئے قائم ہوئی تھی۔ ۳۰۰ طالب علم باہر کے ملکوں میں تعلیم کے لئے جا چکے ہیں ۵۱۴ مگر جب ان کا مقابلہ ان طالب علموں کی تعداد سے کیا جائے۔ جو ایک وقت میں یورپ اور امریکہ میں کتابی علوم کے حصول کے لئے جاتے ہیں۔ تو یہ ظاہرا خوشی رنج سے بدل جاتی ہے۔ اگر سولہ برس میں چار سو طالب علم بھی یورپ اور امریکہ صنعتی تعلیم کیلئے گئے ہیں۔ تو فی سال ۲۵ کی اوسط ہوئی۔ مگر لارڈ لٹن کی کمیٹی نے انگلستان میں حال میں تحقیقات کی تو معلوم ہوا کہ محض انگلستان میں دو ہزار ہندوستانی طالب علم کتابی علوم کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اور ان میں سے پانچ سو بیرسٹری کے طالب علم ہیں۔ اگر ان میں سے ہر ایک طالب علم پانچ ہزار روپیہ سالانہ بھی خرچ کرتا

---

۵۱۲ دیکھو سالانہ رپورٹ وکٹوریا جبلی ٹیکنیکل انسٹیٹیوٹ بابت ۱۹۱۹-۲۰ء
۵۱۳ ہندوستان کی ٹیکنیکل کالجوں کی ڈائرکٹری مرتبہ سکرٹری انڈین انڈسٹریل کانفرنس ص ۱۲۰ ۵۱۴ رپورٹ انڈسٹریل کمیشن ۱۹۱۹ء ص ۱۰۶-۷

ہو۔ اور یہ رقم آج کل کے حساب سے ۳۳۳ پونڈ کے قریب ہوتی ہے
جو موجودہ گرانی کے زمانے میں زیادہ نہیں۔ تو اس وقت محض انگلستان
میں ہندوستان کے طالب علم کتابی علوم کے لیئے ایک کروڑ روپیہ
سالانہ خرچ کر رہے ہیں۔ اور جو یورپ کے دوسرے ممالک اور امریکہ
میں انہی علوم کے لیئے خرچ کر رہے ہیں۔ وہ اس کے علاوہ ہے۔
اگر یہی کروڑ روپیہ سالانہ ایسے فنون سیکھنے پر خرچ ہوتا۔ جو ہندوستان
کے لیئے وہ اشیاء تیار کرتے۔ جن کو ملک اس وقت نہ بنا سکنے کی وجہ سے
دنیا کے سامنے ایک محتاج فقیر کی طرح ہے۔ تو ملک کو کتنی تقویت
ہوتی۔ اور آسودگی کس قدر بڑھتی۔ اس کروڑ روپے سالانہ سے بھی
بڑھ کر ڈر ہمیں اس خرچ کا ہے۔ جو ان دو ہزار طالبعلموں پر ہوگا۔ جب
یہ واپس ہندوستان آئیں گے۔ اور ان کا تمام بوجھ بیچارے زمیندار کے
سر پر ہوگا۔ خواہ وہ گورنمنٹ کی ملازمت کریں۔ یا وکالت کریں۔
بالخصوص تعجب ان پانچ سو قانون کے طالبعلموں پر ہے۔ جو اس ملک
میں قانون کی تعلیم پا کر بھی ویسا ہی کما سکتے ہیں۔ جیسا لنڈن سے
واپس آکر کیونکہ وکالت اور بیرسٹری میں بلحاظ کمائی اور عزت کے
کوئی فرق نہیں۔ ان میں سے جو کوئی بھی محنتی اور ہوشیار ہوگا۔
وہ دوسرے سے سبقت لے جائیگا۔

تیسرا باب

ہندوستان میں صنعت کی پست حالت اور اس کے اسباب

ہندوستان میں تعلیم یافتہ گروہ کی صنعت اور زراعت کی طرف سے بے رخی کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہے۔ کہ ہندوستان کی حیثیت ان فنون میں اور ملکوں کے مقابلے میں کیا ہے۔ کیا کبھی اس سے بہتر حالت بھی تھی۔ اور اگر نہیں تو اس پستی کے اسباب کیا ہیں۔

اٹھارہویں صدی میں ہندوستان اور یورپ کی صنعتی حالت میں بہت بڑا فرق معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض چیزوں میں ہندوستانی صنعت یورپ سے ممتاز تھی۔ ان اشیاء میں کپڑا خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے (حاشیہ ۱) مگر یورپ میں ایک بات پندرھویں صدی سے شروع تھی۔ اور وہ ہندوستان میں نہیں تھی۔ یہ ترقی کی عام خواہش تھی۔ جو مختلف رنگوں میں ظاہر ہو رہی تھی۔ ہر ملک میں آگے

حاشیہ ۱۔ سنہ ۱۶۱۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی بہت سی اشیا ہندوستان سے لائی۔ اور بعض کاریگر بھی ہندوستان بھیجے گئے جنہوں نے انگریزی مذاق کے مطابق نمونے بنوائے۔ انکو اتنی بڑی کامیابی ہوئی۔ کہ اسوقت یہ کہا جاتا تھا۔ کہ بڑے سے بڑے خوش مذاق جوانوں سے لیکر ادنی سے ادنی ماماؤں تک ہندوستانی کپڑوں کے سوائے اور کسی کپڑے کو پہننا پسند نہیں کرتے اور نہ ہی کمروں۔ پلنگ۔ میز وغیرہ کی آرائش کے لئے ہندوستانی پردوں کے برابر اور کھانے کے میز کے لئے چینی اور لاکھ کے برتنوں کے برابر کوئی چیز تھی۔

دگروتھ آف انگلش انڈسٹری اینڈ کامرس مصنفہ کننگھم جلد ۲ ص ۲۶۳)

بڑھنے کا جوش پایا جاتا تھا۔ اس کا پہلا ظہور نئے ممالک دریافت کرنے کے رنگ میں ہوا۔ چنانچہ اہل یورپ اسی جوش کے اثر سے ہندوستان بھی پہنچے۔ جاپان اور چین میں بھی گئے۔ اور امریکہ بھی دریافت کیا۔ اسی ترقی کے جوش کا ظہور علوم سائنس میں بھی ہوا۔ اور اسی کا ظہور اٹھارھویں صدی کے آخر میں صنعت اور زراعت کی ترقی کے رنگ میں ہوا۔ اٹھارھویں صدی میں یورپ علوم سائنس میں ہندوستان اور عام ایشیائی دنیا سے بہت بڑھ کر تھا۔ مگر اس وقت اسے وہ عالمگیر فوقیت صنعتوں میں حاصل نہیں ہوئی تھی۔ جو بعد میں ہوئی۔ اگرچہ اس عظیم الشان عروج کی بنیادیں اس سے بھی پہلے رکھی جا چکی تھیں۔

سن ۱۷۷۰ء اور سن ۱۸۴۰ء کے درمیان ستر برس میں انگلستان میں وہ عظیم الشان انقلاب پیدا ہوا۔ جس کو انڈسٹریل ریوولیوشن یا صنعتی انقلاب کہتے ہیں۔ اس انقلاب کا خلاصہ یہ تھا۔ کہ جو کام ہاتھ سے بڑی محنت اور بہت دقت کے بعد تیار ہوتے تھے۔ وہ مشینوں کے ذریعہ سے تھوڑی محنت اور تھوڑے وقت میں تیار ہونے لگے۔ جس کے معنے یہ تھے۔ کہ مشین کی بنی ہوئی اشیاء ہاتھ کی بنی ہوئی چیزوں سے بہت سستی ہوتی تھیں۔ جن ملکوں میں مشینوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔ وہ بہت سستی اشیاء بنا کر دوسرے ملکوں میں جہاں مشینوں کا استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ بھیجنے لگے۔ اور ان ممالک کے دستکار لوگوں نے جب دیکھا۔ کہ تمام لوگ مشین کی بنی ہوئی سستی چیزیں خریدتے ہیں۔ اور ان کی مہنگی مصنوعات کا کوئی خریدار نہیں۔ تو مجبور ہو کر انہوں نے اپنا پیشہ ترک کر دیا اور دوسرا کوئی کام اختیار کر لیا۔ اس طرح سے آئندہ نسل کو شروع سے ہی ان پیشوں کے سیکھنے کے لئے کوئی ترغیب نہ رہی اور ایسے ملکوں کی دستکاریاں بہت کم رہ گئیں۔ اور صرف وہی

رہ گئیں۔ جو مشینوں کے مقابل میں سستا مال بنا سکتی تھیں۔ کپڑے
کی صنعت کے لئے مختلف ایجادوں کی مختصر کیفیت یوں ہے :۔ کے
کی فلائنگ شٹل اور پال کے کاتنے والے رولر سے ۱۷۳۸ء میں ایک
ایجادات کا سلسلہ شروع ہوا۔ جو ہارگریو کی کاتنے والی جینی
(jenny) آرک رائٹ کی ایجادات اور کامپٹن کی کاتنے
والی میول (Spinning mule) (۱۷۷۹ء)
پر مشتمل تھا۔ ان ایجادات کی وجہ سے کتے ہوئے سوت کی بہت
کثرت ہوگئی۔ کیونکہ ہارگریو کی مشین جینی کی ایجاد کے بعد ایک کاتنے
والا ۱۸۱۲ء میں اتنا سوت کات لیتا تھا۔ جتنا اس سے پہلے دو
سو آدمی کاتتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ جلاہوں کی بہت قدر
ہونے لگی۔ اور بہت لوگوں نے دستی کھڈیوں پر روپیہ خرچ کیا۔
مگر ۱۷۸۵ء میں کرامپٹن کی طاقت سے چلنی والی کھڈی کی وجہ
سے یہ رونق گئی۔ دستی کھڈی طاقت کی کھڈی کا مدت تک مقابلہ
کرتی رہی۔ کیونکہ طاقت کی کھڈی میں بانا تانے پر ابتدا میں
ٹھیک نہیں بیٹھتا تھا۔ مگر دستی بننے والوں کا کام ان کے ہاتھ سے
آہستہ آہستہ نکلتا گیا۔ یہاں تک کہ ۱۸۴۰ء میں بوڑھے یا ہٹ دھرم
آدمیوں کے سوا اور کوئی اس پیشہ میں نہ رہا۔ ۵۲ تمام تبدیلیوں کا
اصل یہ ہے۔ کہ جبکہ ہاتھ کی آسان ترین حرکت آگے اور پیچھے
ہوتی ہے۔ مشین کی آسان ترین حرکت مدور ہوتی ہے۔ ہاتھ کی
حرکت کی رفتار محدود ہوتی ہے۔ اس لئے اگر اسے بہت کام کرنا
ہو۔ تو اس کی قوت کا بہت سا حصہ ہر موقعہ پر خرچ ہو جاتا ہے۔
مگر مشین میں گیرنگ اور دیگر ترکیبوں سے بڑی سے بڑی رفتار
پیدا ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ اس میں گرمی یا خراش زیادہ پیدا نہ

---

۵۲ انڈسٹری اینڈ ٹریڈ مصنفہ الفریڈ مارشل صہ ۵۸

ہو۔ ان ہی شرائط کی وجہ سے مدت تک ترقی رکی رہی۔ مگر اب میکنکل اور کیمیاوی ایجادوں کے باعث یہ روکیں بہت حد تک دور ہو گئی ہیں۔ اور بڑے بڑے ٹربین پہیے آسانی سے ایک سیکنڈ میں ایک سو چالیس گردشیں کر سکتے ہیں۔ پہیوں کا بیرونی حصہ نوسو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتا ہے۔ ان ایجادوں کے باعث سینما کے لئے ایک سیکنڈ میں کثیر التعداد صاف فوٹو لئے جا سکتے ہیں۔ اور ایک اکیلی مشین ایک گھنٹے میں ڈھائی لاکھ دیا سلائی بنا لیتی ہے۔ چھ گھنٹوں میں اخبار کے بڑے بڑے چوبیس صفحوں کے ٹائپ کو ترتیب دے کر ان کے بہت سے سیٹریوٹائپ (عکس) لیکر ہر ایک عکس پر بغیر کسی مزید تکلیف کے بہت چوڑے کاغذ کے لمبے لمبے رول بیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چھپنے شروع ہو جاتے ہیں۔ یعنی بیس میل لمبا کاغذ ایک گھنٹے میں چھپ جاتا ہے ایک نیا فولاد جو ... درجہ کی گرمی تک نہیں پگلتا۔ معمولی فولاد کو اس طرح کاٹتا چلا جاتا ہے۔ جیسے معمولی فولاد لکڑی کو"۔ ۵۳

ان ایجادوں کا لازمی نتیجہ ہے۔ کہ تمام پرانے طرز پر کام کرنے والے اپنے کاموں کو طوعاً و کرہاً چھوڑ دیں۔ کیونکہ جس قدر ارزاں اشیاء مشین میں تیار ہو سکتی ہیں۔ ہاتھ سے نہیں ہو سکتیں۔ اب اگر لنڈن ڈیلی میل کے مالک اپنا گز لمبا بارہ صفحوں کا اخبار بجائے پریس میں چھاپنے کے بارہ تیرہ لاکھ کی تعداد میں ہاتھ سے لکھوا کر شائع کرنا چاہیں۔ تو انہیں بارہ لاکھ پرچہ لکھنے کے کم از کم ۲۴ لاکھ آدمی چاہئیں۔ اور ایک پرچے کی قیمت اس وقت کے حساب سے نو دس روپے سے کم نہ ہوگی۔ مگر وہی اخبار اب صرف ایک آنے کو بکتا ہے۔ یا دیا سلائیاں ہی اگر ہاتھ سے بنائی جائیں۔ تو کتنی مہنگی

---

۵۳ ٹریڈ اینڈ انڈسٹری مصنفہ الفریڈ مارشل ص ۲۱۰

پڑیں۔ ان چیزوں کے مہنگے ہونے کا یہ مطلب ہے۔ کہ انسانی قوت اور وقت کا بہت حصہ ان کاموں پر خرچ ہو جاتا ہے۔ اور بہت سے اور کاموں کے لئے نہ آدمی بچتے ہیں۔ اور نہ وقت۔ مشینوں کے استعمال کرنے سے اشیاء سستی اور جلدی بنا لینے میں یہ بہت بڑا فائدہ مستور ہے۔ کہ چند آدمی تھوڑے سے وقت میں تمام ملک کی ایک خاص قسم کی ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں۔ اور باقی تمام لوگ دوسرے انواع و اقسام کاموں کے لئے فارغ ہو جاتے ہیں۔ اور کسی شخص کو بھی اس شکایت کا موقعہ نہیں رہتا۔ کہ اسے باربردار جانور کی طرح اتنا کام کرنا پڑتا ہے۔ کہ علمی مشاغل کیلئے اسکے پاس وقت نہ بچے

بعض لوگ مشینوں کو اس خیال سے ناپسند کرتے ہیں۔ کہ مشینوں کے آنے کے بعد مزدوروں کی حالت ابتر ہو گئی ہے۔ [۵۴] اسمیں شک نہیں۔ کہ انیسویں صدی کے ابتدا میں یورپ کے کارخانہ دار مزدوروں پر بہت ظلم کرتے تھے۔ ان سے قریباً ۱۲ گھنٹے روزانہ کام لیتے تھے۔ اور نہایت قلیل مزدوری دیتے تھے۔ مگر اب یہ مظالم ختم ہو چکے ہیں۔ اب عموماً اکثر ملکوں میں آٹھ گھنٹے روزانہ سے زیادہ کام نہیں لے سکتے۔ اور بعض سخت کاموں مثلاً کان کنی وغیرہ میں صرف چھ گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے۔ اور مزدوری کی شرح بھی وہ مقرر ہوئی ہے۔ جس کو خود مزدوروں کے نمائندوں نے منظور کیا ہے۔ مزدوروں کی گذشتہ ابتر حالت کا الزام مشینوں کو نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ اس الزام کے مستحق یورپ کے سرمایہ دار تھے۔ جنہوں نے اپنے نفع کو انسانوں کی جان سے زیادہ عزیز سمجھا۔ مگر اس شر سے ایک عظیم الشان خیر پیدا ہوئی۔ اور وہ مزدوروں میں اپنی حالت کا احساس تھا۔ جس سے سوشلزم کا طریق نکلا۔ اور

---

[۵۴] انڈین ہوم رول مصنفہ مہاتما گاندھی ص ۹۵ و ۹۶

اور اب یورپ کے ہر ملک کے مزدور اس قابل ہیں۔ کہ اپنی حالت خود سنبھال سکیں۔ اور وہ منافع جو ان کی محنت سے پیدا ہو کر سرمایہ داروں کی جیبوں میں جاتا تھا۔ اب اس کا حصہ ان کو بھی ملتا ہے۔ چنانچہ روس اور جرمنی میں تو سلطنت بھی مزدوروں کے ہاتھ میں ہے اور انگلستان میں بھی مزدوروں کا اتنا اقتدار بڑھ گیا ہے۔ کہ کچھ تعجب نہیں۔ کہ انگلستان بھی مزدوروں کی جماعت کے ہاتھ میں آ جائے

مشینوں کے رواج کے بعد جب انگلستان کی کھڈیاں بند ہو گئیں۔ ویسے ہی لازم تھا۔ کہ ہندوستان کی کھڈیاں بھی بند ہوں۔ مگر انگلستان کی گورنمنٹ نے مشینوں کے اثر کے علاوہ بھاری محصول لگا کر یہ ناممکن کر دیا تھا۔ کہ ہندوستان کا کپڑا انگلستان میں جا کر بک سکے۔ چھینٹ ہندوستان سے لا کر اگر یورپ کے اور ملکوں میں بیچی جاتی تو اس پر پنس ۸ - شلنگ ۶ - پونڈ ۳ فی صدی محصول ملک میں داخلہ پہ لگتا تھا اور اگر اس کی کھپت انگلستان میں ہوتی۔ تو پنس ۸ - شلنگ ۶ - پونڈ ۶۸ فی صدی محصول اس کے علاوہ لیا جاتا تھا۔ ململ پر داخلہ کے وقت دس فیصدی محصول تھا۔ اور اگر ملک میں خرچ ہو۔ تو پنس ۸ - شلنگ ۶ - پونڈ ۲۷ فی صدی محصول تھا۔ رنگ دار کپڑوں کا جو ہندوستان سے جاتے تھے۔ انگلستان میں بیچنا ممنوع تھا۔ وہ انگلستان میں اتار کر یورپ کے دوسرے ملکوں میں بیچے جاتے تھے۔ ان پر داخلہ کے وقت محصول ۳ پونڈ ۶ شلنگ ۸ پنس فی صدی تھا۔ اس کے علاوہ محصول کے اوپر بیس فی صدی محصول اور ایزاد کیا گیا تھا۔ جس سے چھینٹ کا محصول ۷۸ پونڈ ۶ شلنگ ۸ پنس اور ململ کا محصول ۳۱ پونڈ ۶ شلنگ ۸ پنس ہو گیا۔ ؎۵ ہنری سینٹ جارج ٹکر نے

؎۵ ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاملات پر شہادات ۱۸۱۳ء منقولہ اکونامک ہسٹری آف انڈیا مصنفہ دت ص ۲۶۱

جو بہت مدت ہندوستان میں رہ کر انگلستان میں جا کر ایسٹ انڈیا کمپنی کا ڈائرکٹر ہو گیا تھا۔ ۱۸۲۳ء میں ذیل کے الفاظ لکھے" وہ تجارتی پالیسی جو ہم نے انگلستان میں ہندوستان کی نسبت اختیار کی ہے۔ کیا ہے؟ ریشمی کپڑے اور نیم سوتی ریشمی کپڑے مدت سے ہماری منڈیوں میں ممنوع ہیں۔ اور کچھ عرصہ سے سوتی کپڑے بھی جو ہندوستان کی سب سے بڑی صنعت تھے۔ ۶۷ فی صدی محصول کی وجہ سے مگر زیادہ تر اعلیٰ مشینوں کی وجہ سے نہ صرف انگلستان میں آنے بند ہو گئے ہیں۔ بلکہ ہم انگلستان کے بنے ہوئے کپڑے ایشیائی مقبوضات میں بھیجنے لگے ہیں۔ اس طرح سے ہندوستان ایک صنعتی ملک کی حیثیت سے گر کر زراعتی ملک ہو گیا ہے"۔ ۵۶ ۱۸۳۸ء میں منٹگمری مارٹن نے اپنی کتاب ایسٹرن سٹڈیز میں لکھا کیا اس رپورٹ کے بعد انگلستان یا ہندوستان میں ہماری خود غرضی اور طمع سے نقصان یافتہ لوگوں کی مدد کے لئے کچھ کیا گیا ہے؟ کچھ نہیں۔ برخلاف اس کے ہم نے ان کو اور بھی نادار کرنے کے لئے پوری کوششیں کیں۔ آزاد تجارت کے بہانے سے ہم نے لنکا شائر۔ یورک شائر اور گلاسگو کی مصنوعات برائے نام محصول لگا کر ہندوستان میں داخل کیں۔ حالانکہ بنگال اور بہار کی خوبصورت اور دیرپا مصنوعات پر انگلستان میں داخلہ کے وقت بھاری اور مانع محصول لگائے جاتے تھے"۔ ۵۷ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ۱۸۱۳ء میں کلکتہ سے بیس لاکھ پونڈ کا کپڑا ولایت گیا۔ اور ۱۸۳۰ء میں بیس لاکھ پونڈ کا کپڑا ولایت سے کلکتہ آیا۔ ولایتی مال پر کلکتہ میں ½ ۲ فی صدی محصول لیا جاتا تھا۔ اور

---

۵۶ گورنمنٹ ہند کی یادداشتیں (مطبوعہ لنڈن ۱۸۵۳ء) ص ۴۹۴ منقولہ اکونامک ہسٹری آف انڈیا مصنفہ دت ص ۲۶۱ - ۲۶۲

۵۷ ایضاً ص ۱۹۹ -

ہندوستانی مصنوعات پر انگلستان میں چارسو فی صدی محصول لیا جاتا تھا۔" ؎۵۸ ذیل کے نقشہ سے یہ انحطاط زیادہ واضح طور پر معلوم ہو جائیگا

کپڑے کی درآمد ہندوستان سے انگلستان میں

سنہ۱۸۱۴ء	۱٬۲۶۶ و ۶۰۸	تھان
سنہ۱۸۲۱ء	۵۳۴ و ۴۹۵	"
سنہ۱۸۲۸ء	۴۲۲ و ۵۰۴	"
سنہ۱۸۳۵ء	۳۰۶ و ۰۸۶	"

کپڑے کی درآمد انگلستان سے ہندوستان میں

سنہ۱۸۱۴ء	۸۱۸۲۰۸	گز
سنہ۱۸۲۱ء	۱۹ و ۱۳۸ و ۷۲۶	"
سنہ۱۸۲۸ء	۴۱ و ۸۲۲ و ۰۷۷	"
سنہ۱۸۳۵ء	۵۱ و ۷۷۷ و ۲۷۷	" ؎۵۹

ایسے ہی یورپ کے اور ملکوں میں جو کپڑا جاتا تھا۔ اس میں کمی واقع ہوئی۔ سنہ۱۸۰۱ء میں امریکہ میں ۱۸۶۳۳ گٹھڑیاں بھیجی گئیں سنہ۱۸۲۹ء میں صرف ۲۵۸ بھیجی گئیں۔ سنہ۱۸۰۰ء میں ڈنمارک میں ۱۴۵۷ بھیجی گئیں۔ سنہ۱۸۲۰ء کے بعد ۱۵۰ سے زیادہ کبھی نہیں گئیں۔ پرتگال میں سنہ۱۷۹۹ء میں ۹۷۱۴ گٹھڑیاں گئیں۔ مگر سنہ۱۸۲۵ء کے بعد ہزار سے زیادہ کبھی نہیں گئیں۔ عرب اور خلیج فارس میں سنہ۱۸۰۱ء اور سنہ۱۸۲۰ء کے درمیان چار اور سات ہزار کے درمیان گٹھڑیاں جاتی تھیں۔ مگر سنہ۱۸۲۵ء کے بعد دو ہزار سے نہیں بڑھیں" ؎۶۰

یہ انحطاط صرف کپڑے کی تجارت ہی میں نہیں ہوا۔ بلکہ تمام

؎۵۸ ایضاً ص۲۹۳۔ ؎۵۹ انڈیا انڈر وکٹورین ایج مصنفہ دت ص۱۱۲۔ ؎۶۰ شہادت پیش کمیٹی ہوس آف کامنز سنہ۱۸۳۲ء منقولہ ایکونامک ہسٹری مصنفہ دت ص ۲۹۶۔

مصنوعی اشیاء میں ہوا۔ انگریزی تجارت کے کھلنے سے پہلے ہندوستان کے لوگ اپنی تمام ضروریات کو خود ہی پورا کرتے تھے۔ جوتے۔ کپڑے۔ کاغذ۔ آہنی سامان وغیرہ سب خود ہی بناتے تھے۔ اور جو چیزیں وہ ملک کے اندر نہیں بنا سکتے تھے۔ ان کی انہیں خواہش نہیں تھی اور اگر خواہش ہوتی بھی تو چونکہ وہ دستیاب نہیں ہو سکتی تھیں۔ کسی کو تکلیف محسوس نہیں ہوتی تھی۔ انگریزی تجارت کھلنے کے بعد ان چیزوں کی صنعت جو ملک میں پہلے بنتی تھیں۔ اس وجہ سے بند ہو گئی۔ کہ یورپ کی بنی ہوئی اشیاء خوبصورت اور تھوڑے داموں پر مل جاتی تھیں۔ اور ان کے علاوہ بہت سی اشیاء جن کی اس ملک میں کسی کو خبر نہ تھی۔ یورپ سے آئیں۔ اور لوگوں نے مفید یا ذریعہ آسائش سمجھ کر ان کو استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اور آہستہ آہستہ وہ بھی ضروریات زندگی میں شامل ہو گئیں۔ اس طرح سے ملک میں ہنر کم ہو گیا۔ اور ضروریات بڑھ گئیں۔ جیسے ڈھاکے کے جلاہوں کا کام بند ہوا تھا۔ ویسے ہی ملک کے تمام اطراف میں ہر قسم کے پیشہ وروں کا کام آہستہ آہستہ بند ہو گیا۔ مثال کے طور پر ہم کاغذ کی صنعت کا ذکر کرتے ہیں۔ سیالکوٹ کے پاس ندی کے کنارے پر ایک بستی ہے۔ جس میں قدیم ایام سے کاغذ ساز رہتے ہیں۔ ان کی آبادی دو سو گھر کے قریب ہو گی۔ شاہی زمانے اور سکھوں کے زمانے میں یہ سب لوگ دوسرے لوگوں سے زیادہ خوشحال تھے۔ مگر اب انگریزی کاغذ آنے کے بعد ان کی حیثیت ایسی گر گئی کہ معمولی مزدور جو مٹی اٹھاتا ہے۔ ایک کاغذ ساز سے زیادہ کماتا ہے۔ کاغذ بنانے کے کارخانوں کی دیواریں سب جھکی ہوئی ہیں۔ اور کھنڈرات کی سی صورت نظر آتی ہے۔ پہلے زمانے میں یہ سب لوگ کاغذ بناتے تھے۔ اور رات دن رسیاں کوٹنے کے جندر ندی پر چلتے رہتے تھے۔ مگر اب دس پانچ آدمی جو کاغذ بناتے ہیں۔ وہ

انگریزی کاغذ کے پرزوں سے بناتے ہیں۔ اگر رسی سے بنائیں۔ تو اتنا مہنگا پڑے۔ کہ کوئی خریدار نہ ہو۔ اور چند کاغذ ساز بھی اس لئے اس کام پر قائم ہیں۔ کہ تمام عمران کی اس پیشہ میں گذر گئی ہے۔ اور اب بڑھاپے میں کوئی دوسرا کام سیکھ نہیں سکتے۔ ان کے لڑکے یہ کام نہیں کرتے۔ اور نہ اسے سیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ان کا کاغذ صرف ساہوکاروں کی بہیوں پر خرچ ہوتا ہے۔ کیونکہ ساہوکاروں کا خیال ہے۔ کہ یہ کاغذ بہیوں کے لئے انگریزی کاغذ سے اچھا رہتا ہے۔

اب ہمارے سامنے سوال یہ ہے۔ کہ اس صنعتی انحطاط کو روکنے کی کیا تدابیر ہو سکتی ہیں۔ اگرچہ بعض لوگ یہ بھی خیال کرتے ہیں۔ کہ اگر ایک ملک میں زراعت آسانی سے ہوتی ہے۔ تو اسے اپنی تمام قوت زراعت پر ہی خرچ کر دینی چاہئے۔ اور دوسرے ملک میں اگر مصنوعات آسانی سے بنتی ہیں۔ تو اسے مصنوعات کی طرف ہی توجہ کرنی چاہئے۔ اور اس طریق سے یہ دونوں ملک اپنی اپنی پیداوار کا تبادلہ کر کے اچھی طرح سے گذارا کر سکتے ہیں۔ اور دونوں فائدے میں رہتے ہیں۔ کیونکہ زراعتی ملک کو مصنوعات اس قیمت پر مل جاتی ہیں۔ جس پر وہ اپنے ملک میں نہیں بنا سکتا اور صنعتی ملک کو زراعتی پیداوار ایسی قیمت پر مل جاتی ہے۔ جس پر وہ خود اپنے ملک میں پیدا نہیں کر سکتا۔ مگر اس طریق میں ایک بڑا نقص ہے۔ دنیا کی قومیں ابھی اس حالت تک نہیں پہنچیں۔ کہ وہ اپنی قوت کا استعمال ایک دوسرے کے خلاف نہ کریں۔ بلکہ اس وقت یہ حالت ہے۔ کہ ہر زبردست قوم ہر کمزور قوم کو زیر کرنا چاہتی ہے۔ اور اس قوم کی محنت سے خود مفاد اٹھانا چاہتی ہے۔ اس زمانے میں صنعت ہی قوت ہے۔ پس جو قوم صنعت میں ترقی کرے گی۔ لازم ہے۔ کہ اس کی قوت بھی بڑھے۔ اور

جب قوت بڑھے گی۔ تو لازم ہے۔ کہ وہ دوسری قوموں پر زیادتی بھی کرے۔ لومڑی سے جب پوچھا گیا۔ کہ تو نے بھیڑ کے بچے کو کیوں مار ڈالا۔ تو اس نے جواب دیا۔ کہ میرا ارادہ ہرگز مارنے کا نہ تھا۔ مگر وہ ایسا موٹا اور ایسا سادہ لوح تھا۔ کہ میں ضبط نہ کرسکی۔ پس کسی قوم کا محض زراعت پر قناعت کرنا اور اپنی حفاظت اور ضرورت کے سامان خود تیار کرنے کے ناقابل ہونا اس قوم کو اس بھیڑ کی طرح بنا دیتا ہے۔ جس کے جسم پر اُون تو بہت ہو۔ مگر وہ ایسی بے کس اور بے ضرر ہو کہ نہ خود کسی کو ضرر پہنچا سکے۔ اور نہ کسی کے ضرر سے اپنی حفاظت کرسکے۔ علاوہ اس کے جو قوم محض زراعت پر قانع ہو۔ وہ زراعت بھی اچھی طرح سے نہیں کرسکتی۔ زراعت میں کان کنی بھی شامل ہے۔ جو قوم اپنے ملک کا کوئلہ یا مٹی کا تیل نکالنے کے لئے اس بات کی محتاج ہے۔ کہ غیر ممالک سے کاریگر اور مشینیں آئیں۔ اور وہ اس کو یہ چیزیں نکال کر دیں۔ اسے یہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ یہ کوئلا اور تیل اس کی چیزیں ہیں۔ بلکہ یہ ان لوگوں کی ملکیت ہیں۔ جو اس کو نکال سکتے ہیں۔ اور یہ ایک اتفاقی امر ہے۔ کہ ان کی ملکیت اس بے ہنر کے ملک میں واقع ہوئی ہے۔ اگر اس قوم اور ان کاریگروں کی قوم میں کوئی مخاصمت کا موقعہ ہوگا۔ تو یہ ان اشیاء سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے گی۔ وہ ان مشینوں بلکہ کانوں تک کو بے کار کرکے چلے جائیں گے۔ خود زمین کی کاشت بھی اگر اعلیٰ طریق پر کرنی ہو۔ تو اس کے لئے مشینوں کی ضرورت ہے۔ جو اگر اپنے ملک میں بنیں۔ تو بوجہ سستی ہونے کے زیادہ کارآمد ہوسکتی ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی زراعتی ملک بھی ریلیں بنانے سے سبکدوش نہیں ہوسکتا۔ اگر جنگ کے وقت باہر سے ریلوں کے حصے نہیں آسکتے۔ تو موجودہ گاڑیوں کے پہیے جتنے گھستے جائیں گے۔ ان کی جگہ نئے نہ آسکنے کی وجہ سے آہستہ آہستہ گاڑیں بند کرنی

پڑیں گی۔ یہ نظارہ ہم یورپ کی جنگ میں دیکھ چکے ہیں۔ کہ جب ریل کا سامان یورپ سے آنا بند ہوگیا۔ تو مجبوراً جو سامان موجود تھا۔ اسی پر قناعت کرنی پڑی۔ اور اس لیئے گاڑیوں کی تعداد تمام لائنوں پر کم کردی گیئی۔ اور ابھی تک اتنی نہیں ہوسکی۔ جتنی لڑائی سے پہلے تھی۔ یہی مشکل روس کو پیش آئی۔ اور مشکل سے وہ اپنی فوجوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے قابل ہوئے بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ ریلیں ملک کے لیئے مضر ہیں۔ اس لیئے ان کا تباہ ہونا ان کے قائم رہنے سے بہتر ہے۔ ریلوں کے چار بڑے نقائص بیان کیئے گیئے ہیں۔ ایک یہ کہ ریلوں ہی کی وجہ سے انگریزوں کا تسلط ہندوستان پر اس قدر مضبوط ہوا ہے۔ دوسری وجہ یہ کہ ریلوں ہی کے ذریعہ پلیگ تمام ملک میں پھیل گیئی ہے۔ تیسری وجہ یہ کہ چونکہ ریلیں ملک کا غلّہ نکال کر غیر ممالک کو لے جاتی ہیں۔ اس لیئے قحط کا موجب بھی یہی ہیں چوتھی وجہ یہ کہ ریلوں کی وجہ سے بدمعاش لوگ مقدس مقامات پر آسانی سے چلے جاتے ہیں اور وہاں بدمعاشیاں کرتے ہیں۔ ؁۱۱ اس کے علاوہ عام طور پر دنیا میں بُرائی پھیلانے کا ذریعہ خیال کی گیئی ہیں۔ نیکی پھیلانے کے لیئے ریلیں مفید نہیں ہیں۔ کیونکہ نیک آدمی نیکی کا بیج بونے کے لیئے لمبے وقت کی ضرورت ہے۔ اُسے تعجیل نہیں۔ کہ اسے ریلوں کی ضرورت ہو۔ ؁۱۲

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے۔ کہ ریل کی حقیقت کیا ہے۔ ریل ایک قوت ہے۔ جس کے ذریعہ سے سامان حیوان اور انسان ایک جگہ سے دوسری جگہ تھوڑے خرچ پر۔ بڑی تعداد میں اور تھوڑے وقت

؁۱۱ انڈین ہوم رول مصنفہ مہاتما گاندھی صہ۴۳ و انٹروڈکشن صہ۲ ؁۱۲ ایضاً صہ ۳۵

میں جا سکتے ہیں۔ اس قوت کا استعمال نیکی پھیلانے کے لئے بھی
ہو سکتا ہے۔ اور برائی کے پھیلانے میں بھی۔ جیسے ہر قوت کے
دونوں استعمال ہو سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ حکومت روپے اور جسمانی قوت
کے بھی دونوں استعمال ہو سکتے ہیں۔ ایسے ہی ریل کے بھی دونوں
استعمال ہو سکتے ہیں۔ یہی حکومت نیک آدمی کے ہاتھ میں دنیا
کے لئے رحمت کا باعث ہوتی ہے۔ اور یہی حکومت شریر آدمی کے
ہاتھ میں لوگوں کے لئے عذاب ہو جاتی ہے۔ یہی روپیہ نیکی پھیلانے
کیلئے بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ اور بدی پھیلانے کے لئے بھی
جسمانی قوت نیکی کے لئے بھی ضروری ہے۔ اور برائی کے لئے بھی
استعمال ہو سکتی ہے۔ ایسے ہی ریلیں غیر ملک پر تسلط جمانے کے
لئے بھی ایسی ہی مفید اور لابدی ہیں۔ جیسی اپنے ملک کی حفاظت
کے لئے۔ اگر ملک کا غلہ تمام غیر ملکوں میں بھیج دیا جائے۔ اور ضرورت
کیلئے بھی سامان نہ چھوڑا جائے۔ تو یہ قحط کا موجب ہیں۔ اور اگر
خشک سالی کے ایام میں باہر سے غلہ لا کر ملک میں بیچا جائے۔ تو یہ قحط
کے دور کرنے کا ذریعہ ہے۔ جیسے بدمعاش لوگ مقدس مقامات پر
آسانی سے جا سکتے ہیں۔ ان سے زیادہ تعداد میں نیک اور غریب
آدمی تھوڑے خرچ پر مقدس مقامات کی زیارت کر آتے ہیں۔ اب
دیکھنا یہ ہے کہ اب تک دنیا میں ریلوں کی وجہ سے آسودگی اور
ثروت پھیلی ہے۔ یا وبائیں۔ اور قحط جن ملکوں میں ریلوں اور جہازوں
کی بہت کثرت ہے۔ اور ملک کی حکومت اپنے ہاتھوں میں ہے وہاں
قحط بند ہو گئے ہیں۔ روس میں جو قحط اس وقت پھیل رہا ہے۔ اس
کی وجہ یہ ہے۔ کہ مسلسل خشک سالی کی وجہ سے ملک میں کچھ پیدا
نہیں ہوا۔ اور ریلوں کے انتظام گاڑیوں اور کوئلہ نہ ہونے کی
وجہ سے بگڑ گئے ہیں۔ اور بولشویک گورنمنٹ کے ساتھ یورپ کی
باقی گورنمنٹوں کے تعلقات اچھے نہ ہونے کی وجہ سے غیر ملکوں

سے غلہ آنا مشکل ہوگیا ہے۔ ورنہ اگر روس کے تعلقات دوسرے ممالک کے ساتھ اچھے ہوتے۔ اور ریل کا انتظام درست ہوتا۔ تو اندرون روس میں یہ تباہی نہ آتی۔ جواب آئی ہے۔ قحط کی وجہ سے زیادہ تر خشک سالی ہوتی ہے۔ جس کا انتظام سوائے ریلوں اور جہازوں کے نہیں ہوسکتا۔ اور دوسرا سبب جو بیان کیا گیا ہے۔ کہ ریلوں کے ذریعہ سے غیر ملکوں میں غلہ لیجایا جائے۔ اور ملک کو خالی کردیا جائے۔ اس کا علاج یہ نہیں ہے۔ کہ ریلوں ہی کی تباہی کی خواہش کی جائے۔ بلکہ یہ کہ ملک کی تجارت پر تسلط حاصل کیا جائے۔ ظاہر فائدہ ریلوں کا اس سال ہمارے اپنے مشاہدے میں آیا۔ اگر ریلیں نہ ہوتیں۔ تو پنجاب کے ان اضلاع میں جہاں چارہ نہیں تھا۔ تمام مویشی مرجاتے۔ اب جو مویشی بچ رہے ہیں۔ وہ اس بھوسہ کی وجہ سے بچ رہے ہیں۔ جو نہری آبادیوں سے خشک اضلاع میں بھیجا گیا تھا۔ اس کے مقابلہ میں ریاست کشمیر کے علاقہ میرپور میں قحط سے بہت سی اموات واقعہ ہوئیں۔ جس کی صرف ایک ہی وجہ تھی۔ اور وہ یہ کہ اس علاقے میں نہ ریل ہے۔ اور نہ سڑکیں اور پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے گھوڑے دان کے سوائے کسی ذریعہ سے غلہ نہیں لیجا سکتے۔ اور گھوڑوں پر کافی غلہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے بہت سے لوگ مدد نہ پہنچ سکنے کی وجہ سے مرگئے۔ ورنہ ملک میں کافی غلہ موجود تھا۔ اور اگر ریلیں چھوڑ سڑکیں بھی ہوتیں۔ تو یہ نقصان نہ ہوتا۔ چنانچہ ریاست کو فوراً ہی قحط کے انسداد کیلئے سڑک بنانے کی ضرورت پیش آئی۔ اور بننی شروع ہوگئی۔ ایسے ہی اس ریاست کشمیر میں ۱۸۷۰ء کے قریب ایک خطرناک قحط پڑا تھا۔ جس میں بہت سی جانوں کا نقصان ہوا تھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ بے موقعہ برف باری سے فصل تباہ ہوگئے تھے۔ اور سڑک نہ ہونے کی وجہ سے غلہ نہیں پہنچ

سکتا تھا۔ اب جب سے کشمیر میں ٹانگے کی سڑک بن گئی ہے۔ کبھی ایسا موقعہ پیش نہیں آیا۔ کہ قحط سے جان کا نقصان ہو۔ خلاصہ یہ کہ ریلیں اور جہاز ہی ایک ذریعہ ہیں جس سے دنیا کے لوگ قدرتی حادثات اور خشک سالی کے وقت ایک دوسرے کی امداد کر سکتے ہیں۔ اور اگر کسی قوم نے ریلوں کو دوسری قوم کو غریب کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ تو اس کا نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ ہم ریلوں کو تباہ کر دیں۔ جیسے اگر کسی طاقت ور آدمی نے اپنے طاقتور ہاتھوں کو کسی کمزور کو مارنے کے لئے استعمال کیا ہو۔ تو اس کا نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ ہم اپنے ہاتھ کاٹ ڈالیں اور اگر ہم اپنے ہاتھ کاٹ ڈالیں گے۔ تو اور بھی اس ظالم کا تختہ مشق بنیں گے۔ صحیح تدبیر یہ ہے۔ کہ ہم بھی اپنے بازوؤں میں قوت پیدا کریں۔ اور اس ظالم کا مقابلہ کریں۔ اور جیسے اس نے اپنی قوت کمزور کے ستانے کیلئے استعمال کی ہے۔ ہم اپنی قوت کمزور کی حفاظت کے لئے استعمال کریں۔

اس اعتراض کا جواب کہ ریلیں طاعون کے پھیلنے کا ذریعہ ہیں۔ یہ ہے کہ اگر ریلیں نہ ہوں۔ تو بھی طاعون پھیل جاتی ہے۔ چنانچہ پنجاب میں ان مقامات میں طاعون پھیلی۔ جہاں سے ریل چالیس پچاس میل بلکہ زیادہ دور تھی۔ اور بعض محققوں نے پتہ لگایا ہے۔ کہ یہ طاعون ہندوستان میں جہانگیر کے وقت میں بھی پھیلی تھیں۔ طاعون کے پھیلنے کا اصل سبب بیمار انسانوں یا چوہوں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ نقل مقام ریل کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ پس اگر ریلیں بند بھی کر دی جائیں۔ اور آلودہ مقام سے دوسری جگہ جانا بند نہ ہو۔ تو بیماری پھیلے گی۔ جب اصل علاج طاعونی مقامات سے لوگوں کی آمد و رفت کا بند کرنا ہو۔ تو وہ ریلوں کی موجودگی میں بھی قرنطینہ کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔ بجائے تمام ملک کی آمد و رفت بند کرنے کے صرف طاعونی مقامات کی آمد و رفت بند کرنی ضروری

ہے ۔ اگر ہندوؤں کے مقامات مقدسہ میں ریلوں کی وجہ سے بدمعاش لوگ چلے جاتے ہیں ۔ یہ ان کی خصوصیت نہیں ۔ تمام قوموں کے مقامات مقدسہ میں جہاں ریلیں نہیں ۔ اور ہزاروں میل کا سفر طے کر کے جانا پڑتا ہے ۔ ایک حصہ ایسے انسانوں کا رہتا ہے ۔ جن کا پیشہ مسافروں کو دھوکا دے کر روپیہ حاصل کرنا ہے ۔ اور ایسے لوگ قدیم سے ایسے مقامات پر رہتے آئے ہیں ۔ البتہ ریلوں کی وجہ سے ایسے مقامات میں آمد و رفت زیادہ ہوگی ۔ زیارت کرنے والے بھی زیادہ جائیں گے ۔ اور اسی تناسب سے بدمعاش بھی زیادہ ہونگے ۔ مگر کوئی وجہ نہیں ۔ کہ بدمعاشوں کی نسبتی تعداد زیادہ ہو جائے ۔ جیسا ہم دیکھتے ہیں ۔ کہ ریلیں بننے کے بعد اور جہاز رانی میں ترقی ہونے کی وجہ سے ہندوستان سے مکہ جا کر حج کرنے والوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے ۔ اور اگر جدہ سے مکہ تک ریل بن جائے ۔ تو اور بھی بڑھ جائیگی ۔ مگر جتنے لوگ حج کے لئے جاتے ہیں ۔ وہ اکثر نیک ارادے لیکر جاتے ہیں ۔ اور جو لوگ ان مسافروں کو لوٹتے ہیں ۔ وہ وہیں کے گرد و نواح کے عرب ہیں ۔ جن کو مکے پہنچنے کے لئے ریل کی ضرورت نہیں ۔ ایسے بڑے بڑے شہروں میں بدمعاش لوگوں کا علاج ان کی براہ راست تنبیہ اور اخراج ہے ۔ نہ کہ تمام دنیا کو ریلوں سے محروم کرنا ۔

باقی رہا یہ سوال کہ ریلوں کی وجہ سے انگریزوں کا تسلط ہندوستان پر قائم ہو گیا ہے ۔ اس کا جواب یہ ہے ۔ کہ اس میں کچھ شک نہیں ۔ کہ انگریزوں کا تسلط ہندوستان پر ریلوں ہی کی وجہ سے مضبوط ہوا ہے ۔ مگر ہندوستان میں خود ہندوستانی بھی سلطنت کریں گے تو بغیر ریلوں کے نہ تو سلطنت کے اجزا پراگندہ ہونے سے بچ سکیں گے ۔ اور نہ ہی غیر ملک سے حملہ آوروں کے خلاف پوری قوت سے حفاظت ہو سکے گی ۔ اس اجمال کی تفصیل یوں ہے

کہ ایک سیاسی مرکز کے ماتحت ایک بڑا ملک اسی صورت میں رہ سکتا ہے۔ جب مرکز کے احکام کے نافذ کرانے کے لئے فوجی قوت اور سامان ملک کے ہر کونے میں سرعت کے ساتھ پہنچ سکے۔ تاکہ کسی سرکش حصّے کو سرکشی کرنے کی جرأت نہ ہو۔ اس کمی کی وجہ سے جب مغلیہ سلطنت وسیع ہو گئی۔ تو سرحدوں پر کمزوری ظاہر ہونی شروع ہو گئی۔ اور دور دور کے عمال اور گورنر خود مختار ہو بیٹھے۔ کیونکہ مرکزی حکومت کے پاس اپنے احکام منوانے کا پورا ذریعہ نہ تھا۔ دوسرا مسئلہ ملک کی بیرونی حفاظت کا ہے۔ ایک وسیع ملک کے لئے جیسا کہ ہندوستان ہے۔ ضروری ہے۔ کہ ملک کے ہر کونے سے آدمی اور سامان قلیل سے قلیل وقت میں سرحدوں پر پہنچ سکے تاکہ پوری قوت کے ساتھ حملہ آور کا مقابلہ کیا جائے۔ اگر ریلوں کا انتظام نہ ہو۔ تو پہلا حملہ اسی فوج کو برداشت کرنا پڑے گا۔ جو سرحد پر مقیم ہے۔ اور لازم ہے۔ کہ وہ تعداد میں کم ہو۔ کیونکہ اگر اس کی تعداد ہمیشہ زیادہ رکھی جائے۔ تو یا تو باقی ملک خالی ہو جائیگا۔ یا ملک اتنا خرچ برداشت نہیں کرسکیگا۔ ہندوستان کا ملک اتنا وسیع ہے۔ کہ اگر اس کی تمام سرحدوں پر ہر وقت اتنی فوج مع پورے سازوسامان کے پڑی رہے۔ جو ہر حملے کا مقابلہ کرنے کیلئے کافی ہو۔ تو تمام ملک کا ایک دن میں دیوالہ نکل جائیگا۔ پس جب غنیم حملہ آور ہوگا۔ تو سرحدی فوج کو مغلوب کرکے آگے بڑھیگا اور جس علاقے میں جائیگا۔ اس علاقے کی فوج کو ایک ایک کرکے مغلوب کرتا چلا جائیگا۔ اور ملک کے محافظوں کو کبھی پوری قوت کے ساتھ لڑنے کا موقع نہ ملیگا۔ اسی صورت میں تمام ہندوستان کو زیر کرنے کے لئے تھوڑی سی فوج کافی ہے۔ کیونکہ قاعدہ ہے۔ کہ جب دو چار میدانوں میں شکست ہو جائے۔ تو باقی علاقوں کی فوجیں ہمت ہار بیٹھتی ہیں۔ اور ہندوستان میں قدیم ایام میں ایسا ہی ہوتا

رہا ہے۔ ہر حملہ آور کو ایک دو میدان فتح کرنے ضروری تھے۔ پھر تمام ملک اس کا تھا۔ یہ کبھی نہیں ہوا۔ کہ ہر گاؤں۔ ہر قصبے اور ہر علاقے نے اپنی آزادی کے لیئے جم کر لڑائی کی ہو۔ پھر ایک اور بڑا خطرہ یہ ہے۔ کہ اگر حملہ آور کے ملک میں ریل ہو۔ تو پھر ایسے ملک کے بچنے کی بہت کم امید ہوتی ہے جس میں ریل نہ ہو۔ جو حملہ کرکے آتا ہے۔ وہ ریلوں کے ذریعہ سے اپنی پوری قوت ساتھ لاتا ہے۔ اور جوں جوں آگے بڑھتا جاتا ہے۔ ریلیں بناتا جاتا ہے۔ ایسے سیلاب کا پاؤں پر چل کر آنے والے سپاہیوں سے مقابلہ ممکن، نہیں۔ یورپ کی جنگ عظیم میں ریلوں کی پوری اہمیت ظاہر ہو گئی ہے۔ جرمنی مشرقی محاذ پر اور مغربی محاذ پر پوری قوت سے اس لیئے اتنے برس تک لڑ سکا۔ اور فوجی معنوں میں کامیاب ہوا۔ کہ وہ اپنی فوجوں کو ضرورت کے وقت مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق بڑی سرعت سے لیجا سکتا تھا۔ اور ایسے مقام پر ڈال دیتا تھا۔ جہاں دشمن کو توقع نہیں ہوتی تھی۔ اس طرق سے جرمنی اپنی تھوڑی سی تعداد سے روس۔ فرانس اور انگلینڈ کی کثیر التعداد افواج کا برابر مقابلہ کرتا رہا۔ اور اس نے ان کو پیچھے ہٹائے رکھا۔ اگر ملک جرمنی میں ریلوں کا جال نہ ہوتا۔ تو جرمنی کبھی اپنے ملک کی حفاظت نہ کر سکتا۔ ایسے ہی روس میں اگر ریلیں نہ ہوتیں۔ تو چار طرف سے روس پر حملے ہو رہے تھے۔ بولشویکی روس دشمن کی فوجوں کو اپنے ملک سے نکال نہ سکتا۔ ایسا ہی اگر ترکوں کے ملک میں ریلیں ہوتیں۔ تو انگریز عراق عرب اور فلسطین پر قبضہ نہ کر سکتے۔ ترکوں کی بڑی کمزوری تھی۔ کہ وہ ان دور کے علاقوں میں کافی سامان اور سپاہی نہ بھیج سکے۔ انگریزوں کو جب بصرے سے بغداد تک بڑھنے کی ضرورت پیش آئی۔ تو انہیں ساتھ ساتھ ریل بنانی پڑی۔ حالانکہ بصرے سے بغداد تک دریا میں بھی

سامان لیجا سکتے تھے۔ ایسے ہی اس وقت ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کی حفاظت کرنیکا مرکز راولپنڈی ہے۔ جس کا تعلق ریل تار ٹیلیفون کے ذریعہ سے ایک طرف تمام سرحدی مقامات کے ساتھ ہے۔ اور دوسری طرف ریل اور تار کے ذریعہ سے ہندوستان کی تمام چھاؤنیوں سے ہے۔ اور خطرہ پیدا ہوتے ہی چند گھنٹے کے اندر ملاکنڈ۔ لنڈی کوتل۔ کوہاٹ بنوں وغیرہ مقامات پر فوج اور سامان پہنچ سکتا ہے۔ اگر ریل کا انتظام نہ ہو۔ تو ہر سرحدی مقام پر راولپنڈی کے برابر چھاؤنی بنانی پڑے۔ غرضیکہ ریل ملک کی آزادی قائم رکھنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ کابل کے امیروں کا خیال تھا۔ کہ ریل بنانے سے ان کا ملک غیر محفوظ ہو جائیگا۔ مگر اب ثابت ہو گیا ہے۔ کہ ریل نہ بنانے کا جو نقصان اپنے ملک کی قوت کے جمع نہ کر سکنے کی صورت میں ہوتا ہے۔ وہ اس فائدے سے بہت بڑھ کر ہے۔ جو دشمن کو اچھی سڑک نہ ملنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ کیونکہ تمام بیدار مغز سلطنتیں اپنے ہمسایہ ملکوں میں ضرورت کے وقت ریل بنانے کیلئے سرحدوں پر ریل کا سامان رکھتی ہیں۔ اور نقشے بھی پہلے ہی سے تیار رہتے ہیں۔

ان سیاسی فوائد کے علاوہ ریلوں کا بڑا فائدہ دنیا کے مختلف حصوں کے لوگوں کا آپس میں ملاپ ہے۔ جس سے ان کے خیالات ایک دوسرے کے متعلق اور تمام عالم کی نسبت زیادہ صحیح اور وسیع ہو جاتے ہیں۔ قلوب میں کشادگی آجاتی ہے۔ اور ایک دوسرے کے حالات کو سمجھ کر وہ اس بات کے قبول کرنے کے لئے تیار ہو سکتے ہیں۔ کہ تمام نوع انسان ایک برادری ہے۔ جن کا آپس میں محبت سے رہنا سب کیلئے ازدیاد راحت کا باعث ہو سکتا ہے۔

البتہ کوئی ملک ریل سے پورا فائدہ اسی صورت میں اٹھا سکتا ہے۔ جب ریل کے کارخانوں کے فورمین اور کاریگر اسی قوم کے ہوں۔ اور ان کی بے وفائی کا احتمال نہ ہو۔ اس لئے ہندوستان

کو ریلوں سے پورا فائدہ پہنچانے کے لیے ضروری ہے۔ کہ تمام کاریگر چھوٹے سے لیکر بڑے تک اہل ملک ہوں۔ اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ کسی ملک کے لیے جائز نہیں ہے۔ کہ وہ صرف زراعت ہی کی ترقی کی کوشش کرے۔ اور اپنی آزادی اور عزت کی حفاظت کی اشیاء بھی غیر ملکوں سے منگوائے۔

اب ہم اصل سوال کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ کہ ہندوستان کے صنعتی انحطاط کو روکنے کی کیا تدابیر ہو سکتی ہیں۔ تمام کوششیں جو اس انحطاط کو روکنے کیلئے کی جائیں۔ وہ دو قسم کی ہوں گی۔ مثبت اور منفی۔ اثباتی کوششیں وہ ہیں۔ جو ان تمام اشیاء کے ملک میں تیار کرنے کیلئے کی جائیں۔ جو غیر ممالک سے تیار ہو کر آتی ہیں۔ مگر یہ کوششیں اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہیں۔ جب ان چیزوں میں وہ خوبی اور ارزانی ہو۔ جو یورپ کی اشیاء میں ہوتی ہے۔ اس خوبی اور ارزانی کے پیدا کرنے کیلئے مشینوں کا لانا اور نئے طریقوں کا سیکھنا ضروری ہے۔ بہت سی ضروری اشیاء اس زمانے میں ایسی پیدا ہو گئی ہیں۔ جن کے بنانے کا قدیم طریق کوئی نہیں تھا۔ اس لئے ان کے تیار کرنے کیلئے بھی نئے طریق سیکھنے اور مشینیں استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ مشینوں سے اشیاء بنانے کیلئے چونکہ بہت بڑے کارخانوں اور انتظامات کی ضرورت ہے۔ اس لیے روپیہ مہیا کرنے کیلئے بنک بنانا بھی ایسا ہی ضروری ہے۔ جیسا مشینوں اور کاریگروں کا مہیا کرنا۔ بینکوں کے علاوہ روپیہ جمع کرنے کے لئے کمپنی کا طریق بھی ہے۔ جس میں بہت سے لوگ مل کر مشترکہ سرمایہ سے ایک کام کو اختیار کرتے ہیں۔ ان اثباتی کوششوں کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ چونکہ صنعتی انحطاط اس وجہ سے ہوا ہے۔ کہ یورپ میں نئے طریقوں اور مشینوں سے اشیاء عمدہ اور ارزاں بنتی ہیں۔ اور ہندوستان کی مہنگی اور ناقص اشیاء

ان کے مقابلے میں بک نہیں سکتیں۔ اس لئے ہندوستان میں بھی انہی مشینوں اور طریقوں سے اشیاء تیار کرنی چاہئیں۔ جن سے یورپ میں تیار ہوتی ہیں۔ تاکہ یہ چیزیں یورپین چیزوں کے مقابل میں بک سکیں۔

منفی طریقے وہ ہیں۔ جن سے غیر ممالک کی بنی ہوئی اشیاء کا داخلہ یا استعمال روکا جائے۔ ان اشیاء کا ملک میں داخلہ دو طرح سے روکا جاتا ہے۔ ایک طریقہ تو یہ ہے۔ کہ قطعاً غیر ملک کی بعض اشیاء کا ہندوستان میں داخل ہونا گورنمنٹ کی طرف سے بند کر دیا جائے۔ دوسرا طریق یہ ہے۔ کہ ان پر بھاری محصول لگایا جائے۔ تاکہ بھیجنے والوں کو نفع نہ ہو۔ اور وہ خود بخود اس ملک میں ایسی اشیاء بھیجنی بند کر دیں۔ استعمال کا روکنا اس طرح سے ہوتا ہے۔ کہ یا تو ملک کی گورنمنٹ کسی چیز کے استعمال کو روک دے اور یا لوگ خود ملک کی بہتری کے خیال سے غیر ملک کی اشیاء کو استعمال نہ کریں۔ سودیشی کی تحریک کی بھی یہی غرض ہے۔ انگلستان ان سب طریقوں کو استعمال کر چکا ہے۔ جیسا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ انگلستان نے ہندوستان کے ساختہ کپڑے دنکا داخلہ بھاری محصول سے اور بعض اقسام کا قطعی ممانعت سے بند کر دیا۔ الزبتھ کے عہد میں غیر ممالک کی ساختہ اشیاء مثلاً چھریوں اور لوہے کے سامان کا داخلہ بند تھا۔ اور ہر قسم کی کوشش کی جاتی تھی۔ کہ ملک کی ساختہ اشیاء ہی استعمال ہوں۔ اتوار اور تعطیل کے دنوں میں ہر شخص کو جس کی عمر چھ برس یا چھ سے زیادہ ہو۔ انگلستان کی ساختہ ٹوپی پہننی پڑتی تھی اور اگر اس کے خلاف کرے۔ تو ہر جرم کے لئے اسے تین یا چار پنس جرمانہ دینا پڑتا تھا۔ [۱۳]

---

[۱۳] گروتھ آف انگلش انڈسٹری اینڈ کامرس مصنفہ کننگھم جلد ۲ صہ ۲۵ و ۲۶

۱۶۶۵ء میں ایک قانون بنا۔ جس کی رو سے جو شخص فرانس کی بنی ہوئی کمبرک یا لان (کپڑوں کے نام) پہنے۔ اسے پانچ پونڈ جرمانہ دینا پڑتا ہے۔ اور جو شخص انہیں بیچے۔ اسے بھی اتنا جرمانہ دینا پڑتا تھا۔ تین سال بعد اس قانون کی ترمیم کرنی پڑی ۱۴؎ ۱۶۵۱ء میں ایک قانون پاس ہوا۔ جس کی رو سے کوئی غیر ملک کا جہاز انگلستان یا نوآبادیوں میں مال نہیں لیجا سکتا تھا۔ یہ قیاس کیا جاتا ہے۔ کہ سترھویں صدی کے آخری حصے میں انگریزی جہاز رانی میں جو ترقی ہوئی۔ اس کے اسباب میں سے ایک یہ سبب بھی تھا۔ ۱۵؎ ۱۶۶۷ء میں کولبرٹ نے انگریزی کپڑے فرانس میں داخل ہونے کیلئے اتنا محصول لگایا۔ کہ اس کا داخلہ بند ہو گیا۔ اس پر انگلستان میں بہت ناراضگی پھیلی۔ اور ۱۶۷۸ء میں فرانس کے ساتھ تجارت بند کر دی گئی۔ جیمز ثانی کی تخت نشینی کے بعد ممانعت اٹھا دی گئی۔ اور بجائے اس کے بھاری محصول لگا دیا گیا۔ مگر انقلاب کے بعد وِگ پارٹی (Whigs) نے دوبارہ فرانسیسی تجارت کو بند کر دیا۔ ۱۶؎ اب حال میں جرمنی کے سستے مال سے اپنی صنعت کو بچانے کیلئے ستمبر ۱۹۲۱ء میں انگلستان میں ایک قانون پاس ہوا ہے۔ جس کی رو سے بہت سی اشیاء پر جو جرمنی سے بن کر آتی ہیں۔ ۳۳ ⅓ فی صدی محصول لگا دیا گیا ہے۔ اس قانون کا نام قانون حفاظت صنعت رکھا گیا ہے۔ ان اشیاء کی فہرست جن پر یہ محصول لگایا گیا ہے۔ ستر صفحے کی کتاب میں دی گئی ہے۔ اور اس میں چھ ہزار اشیاء درج ہیں۔ پہلی اکتوبر ۱۹۲۱ء کو اس قانون کا اجرا ہو۔ ۱۷؎

مگر کسی ملک کی صنعت صرف منفی کوششوں سے ترقی نہیں کر

۱۴؎ ایضاً ص ۱۷۵۔ ۱۵؎ ایضاً ص ۲۰۹۔ ۲۱۳۔ ۱۶؎ ص ۵۸
۱۷؎ اخبار پانیر ۲۵ ستمبر ۱۹۲۱ء۔

سکتی۔ انگلستان میں اس قسم کی کوششیں سنہ ۱۲۷۱ء سے شروع ہوئیں اس وقت ہالینڈ سے اونی کپڑا لانا بند کر دیا گیا تھا۔ ۱۵۹ء مگر انگلستان کی کپڑے صنعت میں ترقی اس وقت سے شروع ہوئی۔ جب ہالینڈ اور بلجیم کے پراٹسٹنٹ بھاگ کر انگلستان میں پناہ گزین ہوئے۔ اور انہوں نے اس ملک میں کپڑے بنانے شروع کئے۔ اور دوسرے ہنر جاری کئے۔ اینٹورپ (Antwerp) کپڑے کی صنعت کے لئے مشہور تھا۔ مگر جب وہاں کے کاریگروں کو بھاگنا پڑا۔ اور وہ انگلستان میں آ گئے۔ تو اس وقت سے اینٹورپ کو زوال ہوا اور مانچسٹر کا عروج شروع ہوا۔ قیاس غالب یہ ہے۔ کہ مانچسٹر کی صنعت کی ترقی محض انہی لوگوں کے ذریعہ سے ہوئی۔ اسی طرح برمنگھم کے عروج کا سبب بھی غالباً یہی لوگ تھے۔ لوہے کا کام تو برمنگھم میں پہلے بھی بنتا تھا۔ مگر بیتل کا کام جس کے لئے یہ اس وقت کے بعد خاص طور پر مشہور ہوا۔ انہی لوگوں کی وجہ سے شروع ہوا۔ اسکے علاوہ شیشے کا کام سوئیاں بنانا چھریوں کا کام بھی جیسا عام طور پر مشہور ہے انہی لوگوں کی وجہ سے شروع ہوا۔ مگر وہ ترقی ۱۶۹ جسکے نظارے ہم آج دیکھ رہے ہیں سنہ ۱۷۳۲ء سے ٭

٭ شروع ہوئی جب کہ ملکہ الزبتھ نے انہیں پناہ دی تھی۔

صنعت کی ترقی صرف مثبت کوششوں سے ہو سکتی ہے۔ مثبت کوششیں جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں یہ ہیں کہ نئے ہنر کو حاصل کیا جائے اور نئی قسم کے اوزاروں کو صنعت کیلئے استعمال کیا جائے۔ منفی طریق صرف مثبت طریق کی امداد کیلئے مفید ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم یورپ سے مشینیں لا کر یورپین طریق پر کسی چیز کو بنانا شروع کریں۔ تو ابتدا میں چونکہ ناتجربہ کاری کی وجہ سے وہ چیز ہمیں ایسی سستی نہیں پڑے گی جیسی پرانے تجربہ کار ممالک بنا کر بھیج سکتے ہیں۔ تو ہمارا کارخانہ خسارے میں رہے گا۔ جب تک اس کی کسی طریق سے امداد نہ کی جائے یعنی یہ کہ اہل ملک اپنے وطن کی مہنگی اشیاء کو خریدیں۔ اور غیر ملک کی سستی اشیاء کو نہ خریدیں۔ تا کہ ان کے کارخانے طفولیت کی حالت سے گذر کر پختہ کار ہو جائیں۔ اور پھر یہ بھی ویسی ہی سستی اور عمدہ چیزیں بنانے

۱۵۹ء کننگھم جلد اول صفحہ ۱۹۲ ۱۶۹ء کننگھم جلد ۲ صفحہ ۸۴

لگیں۔ جیسے غیر ممالک کے کارخانے۔ یا یہ کہ گورنمنٹ غیر ممالک کی اشیاء پر اتنا محصول لگائے۔ کہ وہ مہنگی بکیں۔ اور اہل ملک ملکی اشیاء کو سستا ہونے کی وجہ سے ترجیح دیں۔ یا ایک اور طریق ہے۔ کہ گورنمنٹ یا اہل ملک کی انجمنیں ایسے نئے کارخانہ داروں کو اتنی امداد دیں کہ ان کا خسارہ پورا ہو جائے۔ اور وہ اسی قیمت پر بیچ سکیں جس پر غیر ملک کی اشیاء بکتی ہیں۔ مگر ان سب طریقوں میں ایک بات مضمر ہے۔ اور وہ یہ کہ اہل ملک کارخانہ داروں اور کاریگروں کی خاطر نقصان اٹھائیں گے۔ اگر ایک شخص کو غیر ملک کی بنی ہوئی چیز سستی ملتی ہے۔ اور وہ اسے نہیں خریدتا۔ اور اپنے ملک کی مہنگی چیز خریدتا ہے۔ تو جتنی زیادہ قیمت وہ ادا کرتا ہے۔ اتنا نقصان اٹھاتا ہے۔ اور یہ رقم بطور امداد اپنے ملک کے کارخانہ دار اور کاریگر کو دیتا ہے۔ گویا اس طریق عمل سے ایک حصہ ملک نقصان اٹھاتا ہے۔ اور دوسرا نفع اگر کاریگر لوگ اور کارخانہ دار اس امداد کو قوم اور ملک سے لیکر اپنے ہنر میں ترقی نہ کریں۔ اور دوسرے ملکوں کے مقابلے کی قابلیت نہ پیدا کریں۔ تو وہ قومی امداد کو ضائع کر رہے ہیں۔ ایسی امداد دیر تک جاری رہ نہیں سکتی۔ ایک غریب آدمی جس کے پاس چند روپے ہیں۔ اور اسے اپنے بیوی بچوں کیلئے کھانے کپڑے اور مکان کا انتظام کرنا ہے۔ اگر وہ غیر ملکی اشیاء خریدے۔ تو اس کا گذارا ہو جاتا ہے۔ اور اگر اپنے ملک کی اشیاء خریدے۔ تو اسے پورا کھانا اور کپڑا بھی میسر نہیں آتا۔ اگر اسے مجبور کیا جائے۔ کہ وہ ملکی اشیاء خریدے۔ تو یہ اس پر ظلم ہے۔ یہی طریق انگلستان میں غلہ کی پیداوار کے بڑھانے کیلئے استعمال کیا گیا تھا۔ غیر ممالک کے غلہ پر بھاری محصول لگایا جاتا تھا۔ تاکہ ملکی غلہ ہی استعمال ہو۔ اور زمینداروں کو نفع ہو۔ مگر عام مزدور پیشہ لوگوں کو اس سے بہت نقصان تھا۔ اور آخر بڑی جد و جہد کے بعد اس قانون کو منسوخ کرنا پڑا۔ ملک کے

غریب لوگوں کو غیر ملک کی سستی اشیاء سے محروم کرنا اسی صورت میں جائز ہے۔ جب ملک میں صنعت کی ترقی کے لیئے کارخانے جاری کیئے گیئے ہوں۔ اور امید ہو۔ کہ اس امداد سے یہ کارخانے اسی حالت پر پہنچ جائیں گے۔ جس پر غیر ممالک کے کارخانے ہیں۔ اور نہ صرف ملک کے مزدور پیشہ لوگوں کیلیئے روزی کا ذریعہ پیدا کریں گے بلکہ خطرے کے وقت میں ملک کو دست و بازو کا کام دیں گے۔ اس طرح وہ امداد جو ابتدا میں ہر غریب آدمی نے ملکی کارخانے کو اس کا مال خرید کرنے میں دی تھی۔ اسے اس رنگ میں واپس مل جائیگی کہ ملک میں روزی کمانے کے ذریعے بڑھ جائیں گے۔ اور بے روزگار لوگ کم ہو جائیں گے۔ برخلاف اس کے اگر غیر ملکی اشیاء بند کر دی جائیں۔ اور ملکی کارخانوں میں ہنر کی ترقی کی کوشش نہ کی جائے۔ بلکہ قدیم اور ناقص طریقوں کو فروغ دیا جائے۔ تو اس سے نہ صرف عام لوگوں کو نقصان ہو گا۔ بلکہ ملک کی قوت کم ہو گی۔ جیسا کہ ہم بار بار لکھ چکے ہیں۔ کہ صنعت کے نئے طریقے صرف اس لئے مفید نہیں ہیں۔ کہ ان سے ملک کی دولت زیادہ ہوتی ہے۔ بلکہ دولت سے زیادہ قیمتی چیز قوت ہے۔ جو ان طریقوں اور مشینوں کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے

ہندوستان میں سودیشی تحریک جو اوّل اوّل بنگال میں جاری ہوئی۔ اور جو اب دوبارہ جاری ہوئی ہے۔ اس میں بڑا نقص یہ ہے۔ کہ اس تحریک کی غرض زیادہ تر غیر ملک یعنی انگلستان کے کپڑے کی تجارت کو نقصان پہنچانا ہے۔ نہ کہ مثبت کوشش سے اپنے ملک کی دولت اور قوت کا بڑھانا۔ اگر ملک کی دولت اور قوت بڑھانا مقصد ہو۔ تو یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے۔ کہ یورپ سے مشینیں منگوا کر کارخانے جاری کئے جائیں۔ اور آہستہ آہستہ صرف انہی اشیاء کا اس حد تک بائیکاٹ کیا جائے۔ جو اپنے کارخانے تیار کر سکیں۔ مگر صرف اسی غرض سے کہ یہ کارخانے حالت ضعف

سے نکل جائیں۔ بائیکاٹ سے بہتر طریق ملکی انجمنوں کی طرف سے فیصدی پیداوار پر امداد دینا ہے۔ جس سے کارخانوں کا ابتدائی خسارہ پورا ہو جائے۔ مشینوں کی بجائے چرخوں کا جاری کرنا ملک کے ضعف کو زیادہ کرتا ہے۔ کیونکہ چرخوں کی صنعت ایک ضعیف چیز ہے۔ جسے غیر ملکی کارخانوں کے سستے کپڑے سے ہمیشہ خطرہ رہیگا۔ اگر فرض کیا جائے۔ کہ ہندوستان کی سلطنت ہندوستانیوں کے اپنے ہاتھ میں بھی ہو۔ اور ہندوستانی گورنمنٹ تمام غیر ملکی کپڑے کا داخلہ بند کردے اور چرخوں کو فروغ دے۔ تو کیا حالت ہوگی۔ نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ ہر ایک زبردست قوم اپنے جہاز مال سے بھر کر لائے گی۔ اور ساتھ ہی جنگی جہاز بھی لائیگی۔ اور بندرگاہوں پر گولہ باری کر کے بے محصول تجارت کے کھولنے کا عہدنامہ کرنے پر مجبور کریگی۔ اور اگر عہدنامے پر پابندی نہ ہوگی۔ تو ملک پر فوجی قبضہ کر کے تجارت کھول دے گی۔ یہ ایک فرضی قیاس نہیں ہے۔ جاپان کے ساتھ بھی ہوا۔ اور ہر ملک کے ساتھ جو اس حالت میں ہو یہی ہوگا۔ ۱۸۵۳ء میں امریکہ نے امیر البحر پیری کو جنگی جہاز دے کر بطور سفیر کے جاپان بھیجا۔ اس وقت تک جاپان نے اپنی حفاظت کا بہترین طریق یہی سمجھ رکھا تھا۔ کہ غیر ملکوں کے ساتھ تجارت نہ کرے۔ جاپان نے امیر البحر پیری کو داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔ دوسرے سال امیر البحر پیری پھر آیا۔ جاپان نے ڈر کر مارچ ۱۸۵۴ء میں معاہدہ کر لیا۔ اسی سال میں روسی سفیر نے بھی جاپان کے ساتھ معاہدہ کیا اور ۱۸۵۶ء میں بہت سی یورپین طاقتوں کے ساتھ معاہدے ہوئے۔ جن کی رو سے سات بندرگاہیں یورپین لوگوں کی رہائش اور تجارت کے لئے کھول دی گئیں۔ غیر ملکی لوگوں پر جاپانی عدالتوں کا اقتدار اٹھا دیا گیا۔ اور غیر ملکی اشیاء پر بھاری محصول لگانے کا اختیار چھین لیا گیا۔ چنانچہ یہ حالت چالیس برس تک رہی۔

اور ۱۸۹۴ء میں ایک معاہدے کی رو سے جو جاپان اور انگلستان کے درمیان ہوا۔ جاپان کو اختیار حاصل ہوا کہ وہ غیر ملکی اشیاء پر محصول لگا سکے۔ ن۵۲

ہندوستان کی سودیشی تحریک میں ایک اور نقص یہ ہے۔ کہ یہ ایک سیاسی حربے کے طور پر استعمال کی جا رہی ہے۔ جس کی غرض انگلستان کو دھمکا کر سیاسی حقوق حاصل کرنا ہے۔ اس لیٔے یہ ملک کی صنعتی حالت کو مضبوط کرنے کے لیٔے زیادہ مفید نہیں ہو سکتی۔ جیسے پہلی سودیشی تحریک جو بنگال میں شروع ہوئی تھی۔ تقسیم بنگال کے منسوخ ہونے کے بعد ٹھنڈی پڑ گئی۔ ایسے ہی موجودہ تحریک کے بھی بعض سیاسی حقوق کے حاصل ہو جانے کے بعد ٹھنڈا پڑ جانے کا خطرہ ہے۔ کیونکہ اس کی بنیادیں مضبوط نہیں ہیں۔ اگر اس کروڑ روپے کا استعمال جو اس سودیشی تحریک کی تقویت کے لیٔے جمع ہوا ہے۔ ملک کی صنعتوں کی ترقی کے لیٔے بینک بنانے پر کیا جاتا۔ یا نئی مشینیں خریدنے پر کیا جاتا۔ تو سودیشی کی بنیادیں ایسی استوار ہوتیں۔ کہ کسی سیاسی تحریک سے متزلزل نہ ہوتیں اب جتنا روپیہ چرخوں پر خرچ کیا گیا ہے۔ وہ سب بوسیدہ ہو کر ٹوٹ جائیں گے۔ اور ملک کا روپیہ رائیگاں جائے گا۔ کیونکہ جب وہ حقوق تھوڑے بہت مل جائیں گے۔ جن کے لیٔے چرخے کو مشین گن قرار دیا جاتا ہے۔ اور اس کی مار سات ہزار میل بتائی جاتی ہے۔ تو یہ چرخے معطل ہو جائیں گے۔ ملک کو ایسی سودیشی تحریک کی ضرورت ہے۔ جو دائمی ہو۔ اور جو سیاسی اغراض کے تبدیل ہو جانے سے معطل نہ ہو جائے۔ اس کی مثال بمبئی کے وہ کپڑے کے کارخانے ہیں۔ جو لنکا شائر کے دلپسیر ہمیشہ سے بار گراں ہیں۔ اور رہیں گے۔ اسی طرح ملک کے ہر حصے میں نئے طریق سے اور نئی مشینوں سے کارخانوں کے قائم کرنے سے سودیشی کی تحریک کو

ن۵۲ نئے جاپان کے پچاس سال مرتبہ کونسٹ آکوما صفحہ ۹۸ و ۱۰۲ و ۱۰۷۔

ایسی تقویت حاصل ہو گی۔ کہ جوں جوں وقت گذرتا جائیگا۔ اس کی قوت بڑھتی جائیگی۔ وہ اپنی قوت سے آپ بڑھے گی۔ اور اسے کسی اور تحریک سے قوت مستعار لینے کی ضرورت نہ رہے گی۔

سیاسی حربے کے طور پر بھی چرخہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ کیونکہ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے۔ جس میں ایک بڑی غیر منتظم آبادی رہتی ہے۔ جو کسی کام کیلئے بھی متحد نہیں ہے۔ جب تک تمام ملک امن کے کاموں کیلئے منتظم نہ ہو جائے۔ تمام لوگ یا ایک کثیر حصہ آبادی مشترک رائے سے مشترک اغراض کیلئے کام کرنے کا تجربہ حاصل نہ کرے۔ اس مشترک غرض کی محبت ان کے دلوں میں ایسی راسخ نہ ہو جائے۔ کہ وہ تمام خود غرضی کے خیالات کو جلادے۔ اور لوگ اپنے مقرر کردہ سرداروں کی اطاعت کے عادی نہ ہو جائیں۔ تب تک کسی سیاسی حربے کی کامیابی مشکل ہے۔ اس وقت جو سیاسی حربہ چلایا گیا ہے۔ اس کے لئے اتنی تھوڑی تیاری کیگئی ہے۔ کہ بے اختیار یہ تشبیہ سوجھتی ہے۔ کہ گویا کوئی ملک کسی دوسرے ملک کو لڑائی کا پیغام بھیج دے۔ اور بعد میں سپاہیوں کو قواعد اور فنون جنگ سکھانے کی اور ان رجمنٹوں کو منظم کرنے کی فکر کرے۔ ایک غیر منتظم ملک کے لئے جس کی قوتیں منتشر ہیں۔ پہلی ضروری بات قومی انتظام کا قائم کرنا اور پراگندہ قوتوں کا جمع کرنا ہے۔

اس تنقید سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے۔ کہ ہم سودیشی تحریک کے خلاف ہیں۔ بلکہ اگر کسی نے ان صفحوں کو غور سے پڑھا ہو گا۔ تو وہ اس نتیجے پر پہنچے گا۔ کہ یہ تحریر شروع سے آخر تک فقط اس مقصد کو حاصل کرنیکے لئے لکھی گئی ہے۔ جو سودیشی تحریک میں مستور ہے مگر اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے صحیح طریق وہ ہے۔ جس کو ہم نے مثبت طریق قرار دیا ہے۔ منفی طریق صرف اس کی امداد کے

لئے مفید ہو سکتے ہیں۔ اگر صرف مثبت طریقوں سے کام لیا جائے۔ اور منفی طریقوں سے امداد نہ لی جائے۔ تو بھی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ اب تک ہندوستان میں بمبئی کے کپڑے کے کارخانوں کے قائم کرنے میں اور کامیاب بنانے میں اور جمشید پور کا ٹاٹا کا لوہے کا کارخانہ قائم کرنے میں محصول یا بائیکاٹ کو دخل نہیں ہے ایسا ہی ۱۸۵۴ء سے ۱۸۹۴ء تک جاپان نے جتنی ترقی کی۔ وہ بغیر محصول یا بائیکاٹ کی امداد کے محض مثبت طریقوں سے کی۔ مگر صرف منفی طریقوں سے کبھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی ملک میں باہر کی اشیاء کی آمد بند کر دی جائے۔ اور اس کے ساتھ ملکی ہنر اور صنعت کی ترقی کیلئے کوشش نہ کی جائے۔ تو ہنر اور صنعت ایسی چیزیں نہیں ہیں۔ جو خود بخود ترقی کرتی چلی جائیں۔ اس کے علاوہ با اختیار سلطنتیں جب ایک دوسرے کی تجارت پر بھاری محصول لگا کر ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کا سلسلہ شروع کر دیتی ہیں تو عام طور پر تجارت اور صنعت میں تنزل شروع ہو جاتا ہے۔ تجارت اور صنعت کے فروغ کیلئے نہ صرف ملک میں امن کا ہونا ضروری ہے۔ بلکہ قلوب میں اطمینان کا ہونا بھی لازم ہے۔ اگر کارخانہ دار کو خفیف سا شبہ بھی ہو گا۔ کہ شاید اس کی مصنوعات کے ساتھ ان ممالک میں جہاں وہ بھیجنا چاہتا ہے۔ بدسلوکی ہو گی۔ تو وہ ان کے بنانے پر روپیہ خرچ نہیں کرے گا۔ اس لئے اکثر اوقات محض غلط افواہ سے بھی چیزوں کی قیمت میں کمی زیادتی ہو جاتی ہے۔

اب ہم مختصر طور پر بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ اب تک نئے طریق پر ہندوستان نے کتنی صنعتی ترقی کی ہے۔ سب سے پہلے قابل ذکر کپڑے کی صنعت ہے۔ اگرچہ سب سے پہلی سوت کاتنے کی مشینیں انگریز سرمایہ داروں کے اہتمام سے ۱۸۲۷ء کے قریب کلکتہ میں بنی تھی۔ مگر کپڑے کی صنعت میں اصل کامیابی بمبئی

میں ہوئی۔ اور اس وقت تک کپڑے کی صنعت کا مرکز بمبئی ہے۔ سنہ ۱۸۵۱ء میں ایک پارسی مسٹر سی این ڈاور نے بمبئی میں پہلا کپڑے کا کارخانہ جاری کیا۔ اور اس کے بعد یہ کارخانے آہستہ آہستہ بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ تمام ہندوستان میں سنہ ۱۸۷۶ء میں کارخانوں کی تعداد ۴۷ ہو گئی۔ جن میں ۱۱۰۰۱۱۲ (گیارہ لاکھ) تکلے۔ اور ۹۱۳۹ (نو ہزار) کھڈیاں کام کرتی تھیں۔ سنہ ۱۸۸۰ء میں کارخانوں کی تعداد ۵۶ ہو گئی۔ اور تکلوں کی تعداد ۱۴۶۱۵۹۰ (چودہ لاکھ) اور کھڈیوں کی تعداد ۱۳۵۰۲ (تیرہ ہزار) تھی۔ ان میں ۴۴۴۱۰ (چوالیس ہزار) آدمی کام کرتے تھے۔ اور ۱۰۷۶۷۰۸ (۱۱۲ پونڈ) ہنڈرویٹ روئی خرچ ہوئی۔ اس کے بعد زیادہ تیزی سے ترقی شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۹۱۹ء میں ۲۵۸ کارخانے تھے۔ جن میں ۶۶۸۹۶۸۰ (چھیاسٹھ لاکھ) تکلے۔ ۱۱۸۲۲۱ کھڈیاں تھیں [۱] اور ۲۹۳۲۷۷ (دو لاکھ) آدمی کام کرتے تھے۔ اور ۷۱۵۴۸۰۵ (اکہتر لاکھ) ہنڈرویٹ روئی خرچ ہوئی۔ سنہ ۱۹۱۷-۱۸ء میں تمام ہندوستان میں مشینوں کے ذریعہ سے ۶۲۶۸۰۰۵۱۰ (باسٹھ کروڑ) پونڈ سوت تیار ہوا۔ سنہ ۱۹۱۸-۱۹ء میں ۵۸۰۵۶۰۷۱۴ (اٹھاون کروڑ) پونڈ تیار ہوا۔ اور سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء میں ۵۹۷۳۵۵۲۹۰ (انسٹھ کروڑ) پونڈ تیار ہوا۔ سنہ ۱۹۱۷-۱۸ء میں مشینوں کے ذریعہ سے ۱۶۱۴۱۲۶۳۵۸ (ایک ارب اکسٹھ کروڑ) گز کپڑا تیار ہوا۔ سنہ ۱۹۱۸-۱۹ء میں ۱۴۵۰۷۲۶۱۶۰ (ایک ارب پینتالیس کروڑ) گز تیار ہوا۔ اور سنہ ۱۹۱۹-۲۰ء میں ۱۶۳۹۷۷۹۲۲۷ (ایک ارب ترسیٹھ کروڑ) گز تیار ہوا۔ اس صنعت کا مرکز احاطہ بمبئی

---

[۱] اس کے مقابلے میں جرمنی میں ۹ ۱/۴ ملین تکلے ہیں۔ اور ۱/۴ ملین کھڈیاں اور انگلستان اور اسکاٹلینڈ میں ۵۵ ملین تکلے ہیں۔ اور نو لاکھ کھڈیاں دیکھو ایوولیوشن آف ماڈرن جرمنی مصنفہ ڈاسن صفحہ ۵۸ (ملین = ۱۰ لاکھ)

ہے۔ چنانچہ تمام سوت میں سے ۴۸ فیصدی بمبئی میں تیار ہوا۔ اور کپڑے میں سے ۲۳۰۷۰۶۰۷۵۳۰۱ گز یعنی تیار ہوا^{۱۲۱} گویا ایک ارب پنتالیس کروڑ میں سے ایک ارب پینتیس کروڑ گز کپڑا احاطہ بمبئی میں تیار ہوا۔^{۱۲۲} اور صرف دس کروڑ گز باقی تمام ہندوستان میں ہوا۔ یہ کپڑا سادہ قسم کا ہے۔ عمدہ اقسام کے کپڑے یہاں تیار نہیں ہو سکتے۔ اور اوسط ۴۶ کروڑ کا کپڑا باہر کے ممالک سے آتا ہے۔ بمبئی کے کارخانے ہندوستانی کوشش کا نتیجہ ہیں۔ اور ان کے سرمایہ میں یورپین لوگوں کا دخل بہت ہی کم ہے۔ اور کارخانوں میں یورپین کاریگروں کی تعداد بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ اس کی وجہ وکٹوریا ٹیکنکل انسٹیوٹ کا وجود ہے۔ جو اس غرض کیلئے بنایا گیا ہے۔ کہ کارخانوں کے لئے اعلیٰ درجہ کی سائنٹفک اور عملی تعلیم دے کر فورمین تیار کرے۔ بمبئی کے کارخانوں کی کامیابی عین اس مدعا کے مطابق ہے۔ جس کا اظہار ہم اس تحریر میں کر رہے ہیں۔ اور اگر ان میں ابھی تک کچھ نقص ہے۔ تو وہ یہ ہے۔ کہ تمام کے تمام کاریگر ہندوستانی نہیں ہیں۔ اور یہ کہ وہ مشینیں جن کا استعمال ان کارخانوں میں ہوتا ہے۔ ملک میں نہیں بن سکتیں۔ بمبئی کے کارخانوں کی ترقی کی وجہ تجارتی اور کاروباری روح جرأت اور تقدیم کی خواہش ہے۔ جو مسلمانوں کی اقوام خوجہ۔ میمن اور بوہروں میں ہے۔ اور شمالی حصہ احاطہ بمبئی کے ہندوؤں اور پارسیوں میں ہے۔ بالخصوص پارسیوں کی قوم قابل تعریف ہے۔ جس نے نہ صرف کپڑے کے کارخانوں میں دوسری قوموں کی رہنمائی کی۔ بلکہ جیسا کہ بعد میں بیان کیا جائیگا۔ ہندوستان کے لئے ہندوستانی سرمایہ سے پہلا لوہے کا کارخانہ بنانے کا فخر بھی اسی قوم کو حاصل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے

---

۱۲۱ اعداد کیلئے دیکھو انڈین پیر بک ۱۹۲۱ء مرتبہ ٹائمز آف انڈیا بمبئی۔

۱۲۲ انڈین انڈسٹریل کمشن رپورٹ ۱۸-۱۹۱۶ء ص ۵۴

کہ اس قوم کا طبعی رجحان تمام ان باتوں کی طرف ہے۔جو قوم کی تقویت کے لئے ضروری ہیں۔

کپڑے کے بعد جیوٹ (Jute) کی صنعت ہے۔جس کا مرکز کلکتہ ہے۔۱۸۵۵ء میں وشمرا میں سیرام پور کے قریب پہلا مشین کا کارخانہ قائم ہوا۔۱۹۱۸-۱۹ء میں ۷۶ کارخانے تھے۔جن میں ۸۳۹۹۵۴ (آٹھ لاکھ) تکلے۔اور چالیس ہزار کھڈیاں کام کرتی تھیں اور ۲۷۵۱۰۱ (دو لاکھ) آدمی کام کرتے تھے۔۱۹۱۸-۱۹ء میں ۵۸ لاکھ سے کچھ زیادہ بوریاں بنا کر باہر بھیجی گئیں۔اور گیارہ کروڑ گز سے کچھ زیادہ کپڑا بنا کر بھیجا گیا۔جیوٹ کی اشیاء جو باہر بھیجی جاتی ہیں۔ان کی قیمت قریباً ۲۴ کروڑ روپے سالانہ ہوتی ہے۔مگر اس صنعت میں ہندوستانیوں کا حصہ نہ روپے کے رنگ میں ہے۔اور نہ کاریگروں کی شکل میں۔اگر کچھ فائدہ ہندوستانیوں کو اس صنعت سے ہے۔تو وہ ان دو ڈھائی لاکھ مزدوروں کے روزگار کی وجہ سے ہے۔جو ان میں کام کرتے ہیں۔یہ صنعت تمام کی تمام یورپین لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔اور اگرچہ یورپین علوم میں اہل بنگال تمام ہندوستان سے آگے ہیں۔مگر وہ صفات جو صنعت اور تجارت کی ترقی کیلئے ضروری ہیں۔ان کا ظہور بنگال میں نہیں ہوا۔قدیم زمانے میں ہندوستانی کپڑا جو غیر ممالک کو جاتا تھا۔اس کا مرکز ڈھاکہ تھا۔مگر نئے طرز پر جو کپڑا بننا شروع ہوا ہے۔اس کا مرکز بمبئی ہے۔چاہئے یہ تھا۔کہ اہل ڈھاکہ نئے طریقوں کو سب سے پہلے اختیار کرتے۔اور اپنی قدیم صنعت کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔مگر انہوں نے اس جرأت اور ہمت کا اظہار نہیں کیا۔جس کا ظہور اہل بمبئی سے ہوا ہے۔ان دو علاقوں بنگال اور بمبئی کا مقابلہ کر کے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔کہ صنعتی ترقی کا انحصار جتنا انسانی صفات پر ہے۔اتنا اور کسی چیز پر نہیں انگریزی تجارت شروع ہونے کے دو مختلف نتیجے دو مختلف علاقوں

میں ظاہر ہوئے۔ بنگال نے جو تمام یورپ میں کپڑے کیلئے مشہور تھا۔ اپنی صنعت ضائع کر دی۔ اور نئی صنعت جو جیوٹ کا کپڑا بنانے کی شروع ہوئی۔ اس میں کوئی حصہ نہ لیا۔ برخلاف اس کے بمبئی نے انگریزی کپڑے کی آمد کے بعد اس کا مقابلہ کرنیکے لیئے وہی طریق اختیار کئے۔ جن سے وہ کپڑا بن کر آتا تھا۔ اور ایسا مقابلہ کیا۔ کہ آج اگر لنکاشائر کو کسی طریق کا خوف ہے۔ تو وہ ان کارخانوں کا ہے۔ جو بالخصوص احاطہ بمبئی میں ہیں۔ یہ مثبت سودیشی تحریک تھی۔ جو بمبئی میں شروع ہوئی۔ بنگال نے اگرچہ مثبت رنگ میں سودیشی کی تحریک میں اب تک کوئی حصہ نہیں لیا۔ منفی سودیشی کا آغاز بنگال ہی سے ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ بنگال کا رخ انگریزی کتابی تعلیم اور سیاسیات کی طرف رہا ہے۔ اور اگر انہوں نے سودیشی کی طرف توجہ بھی کی۔ تو اسے ایک سیاسی حربے کی طور پر استعمال کرنے کیلئے۔ البتہ اب چند سال سے اہل بنگال کا رخ زمانے کا تجربہ حاصل کر کے صنعت کی ترقی کی طرف بھی ہوا ہے۔ اور اب بنگالی صنعتی تعلیم حاصل کرنے کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔

بمبئی اور کلکتہ کے علاوہ کانپور بھی شمالی ہند میں نئے طریق کی صنعت کا مرکز ہے۔ کانپور میں پانچ بڑے چمڑے کے کارخانے ہیں۔ جن میں چھ ہزار سے زیادہ آدمی کام کرتے ہیں۔ چھ سوتی کپڑے کے کارخانے ہیں۔ جن میں گیارہ ہزار آدمی کام کرتے ہیں۔ چار خیمہ دوزی کے کارخانے ہیں۔ ایک بہت بڑا اونی کپڑے کا کارخانہ ہے۔ تین کھانڈ کے کارخانے ہیں۔ ایک برش بنانے کا کارخانہ ہے۔ ؂۵۲۳ یہ کارخانے بھی زیادہ تر یورپین لوگوں کے سرمایہ اور انتظام سے چل رہے ہیں۔ گورنمنٹ ہند کی رپورٹ

؂۵۲۳ انڈین انڈسٹریل کمیشن رپورٹ ۱۹۱۶-۱۸ء ص ۲۸

مرتبہ رشبرک ولیمز بابت ۱۹۲۰ء سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اب گورنمنٹ کی طرف سے فوجی اور عام ضرورت کے بوٹ بنانے کے کارخانے قائم کرنے کا انتظام ہو رہا ہے۔ اور امید کی جاتی ہے۔ کہ ۲۵ لاکھ بوٹ سال میں بنا سکیں گے۔ چمڑا بنانے کے کارخانے کانپور اور مدراس احاطہ میں ہیں۔ اور جگہوں میں بھی ہوتے جاتے ہیں۔ مگر ابھی تک ملک کا گذارا باہر سے آتے ہوئے چمڑے پر ہے۔

اونی کپڑے کے کارخانے تمام ہندوستان میں پانچ ہیں۔ ان میں ۳۹۶۰۸ (انتالیس ہزار) تکلے اور ۱۱۵۵ کھڈیاں کام کر رہی ہیں۔ کل کپڑا جو ۱۹۱۷ء میں بنا ۹۷۴۴۲۶۴ (ستانوے لاکھ) پونڈ وزن میں تھا۔ کل ۷۸۲۴ (سات ہزار) آدمی کام پر لگے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی ریاستوں میں صرف میسور میں ایک کارخانہ ہے۔ جس میں ۱۹۰۷ء میں ۱۷۲۴۰۸۷ (سترہ لاکھ) پونڈ کپڑا بنا۔ ان میں سے کپڑا بنانے کے کارخانے صرف تین ہیں۔ باقی کارخانے کمبل بناتے ہیں۔

کاغذ بنانے کے اس وقت ہندوستان میں پانچ کارخانے ہیں۔ جن میں تیس ہزار ٹن سالانہ کاغذ بنتا ہے۔ اور ملک کی کل ضرورت اسی ہزار ٹن کے قریب ہے۔ پنسلیں بنانے کا کام گورنمنٹ کے اہتمام سے مدراس میں شروع ہوا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس میں کامیابی ہوئی ہے۔

شیشے کی اشیاء بنانے کا کام ہندوستان میں قدیم زمانے سے تھا۔ مگر یہ فن اس زمانے میں بہت ترقی کر گیا ہے۔ اور پرانے شیشہ گر نئے طرز کی چیزیں نہیں بنا سکتے۔ اور نہ ہی ان کا شیشہ ایسا صاف ہوتا ہے۔ جیسا کہ نئے طریقوں سے بنا ہوا شیشہ۔ نئے طرز کے چودہ کارخانے اس وقت ہندوستان کے مختلف شہروں میں لیمپ کی چمنیاں بناتے ہیں۔ ان میں سے دو تین بوتلیں

بھی بناتے ہیں۔ مگر ان کے پاس ایسی مشینیں نہیں ہیں۔ اور نہ ہی فن ہے۔ جس سے عمارت میں لگانے کے شیشے کے پلیٹ یا برتن بنا سکیں۔ چینی کے انسولیٹر جو تار کے کھمبوں پر لگائے جاتے ہیں۔ ادنیٰ قسم کے بنتے ہیں۔ مگر چینی کے اعلیٰ قسم کے برتن نہیں بن سکتے۔ دیاسلائی بنانے میں اب تک ہندوستان میں چنداں کامیابی نہیں ہوئی۔ مگر اب برہما میں دو کارخانے بنے ہیں۔ جن سے امید ہے۔ کہ اچھے نتائج پیدا ہوں گے۔ ان میں سے ایک کا مالک ایک چینی ہے۔ اور دوسرا یورپین انتظام کے ماتحت ہے۔

سب اشیاء سے ایک معنوں میں ضروری اشیاء وہ ہیں۔ جو لوہے اور فولاد سے بنتی ہیں۔ ہر ایک قسم کی صنعت کا آج کل دارومدار مشینوں پر ہے۔ جو لوہے کی بنتی ہیں۔ اگر کسی ملک میں یہ مشینیں بن سکیں۔ تو سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ اور چیزوں کے بنانے میں ایک بڑی روک اٹھ گئی۔ ہندوستان میں اس وقت دو بڑے بڑے لوہے کے کارخانے ہیں۔ ایک کا نام بنگال آئرن اینڈ سٹیل کمپنی ہے۔ یہ کارخانہ سنہ ۱۸۷۵ء میں شروع ہوا۔ سنہ ۱۸۸۹ء میں موجودہ کمپنی کے ہاتھ میں آیا۔ اور بیس سال کی متواتر کوشش کے بعد اب نفع دینے کے لائق ہوا ہے۔ اس کارخانہ میں لوہا کان سے نکال کر صاف کیا جاتا ہے۔ اور لوہے کے نلکے ۱۲ انچ گولائی تک کے بنتے ہیں۔ اور ستون سلیپر اور کرسیاں بنتی ہیں۔ اس کارخانے میں دس ہزار کے قریب آدمی کام کرتے ہیں۔

دوسرا لوہے کا کارخانہ ٹاٹا آئرن اینڈ سٹیل کمپنی کا ہے۔ اس میں لوہے کو کان سے نکالکر صاف کرتے ہیں۔ اور ریلیں بناتے ہیں۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں اس کارخانہ میں ۲۳۲۳۶۸ (دو لاکھ) ٹن لوہا بن کر نکلا۔ اور ۱۳۴۰۶۱ (ایک لاکھ) ٹن فولاد جس میں ریلیں بھی شامل ہیں۔ اس کے مقابلے میں بنگال سٹیل کمپنی میں ۸۴۹۶۵

دیوراسی ہزار، ٹن لوہا بنا۔ اور ۲۹۶۳۵ ٹن لوہے کی اشیاء بنیں۔ بنگال کمپنی کے مالک و مہتمم غالباً یوربین ہیں۔ ٹاٹا سٹیل کمپنی کا تمام سرمایہ ہندوستانیوں کا ہے۔ اور اس کی ہستی ان کوششوں سے ظہور میں آئی۔ جو قابل تقلید ہیں۔ مسٹر جمشید ٹاٹا نے ہندوستان میں لوہا صاف کرنے کا کارخانہ بنانے کی کوششیں ۱۸۸۲ء میں شروع کیں۔ وسط ہند میں ایک لوہے کی پہاڑی ہے۔ جو ۱½ میل لمبی دو سو گز چوڑی۔ اور سو سے ایک سو بیس فٹ تک اونچی ہے۔ اس مقام کو لوہارا کہتے ہیں۔ وسط ہند میں پانچ یا چھ لوہارے اور بھی ہیں۔ اس پہاڑی کے وجود کا سب سے پہلے فان شوارز ایک جرمن ماہر نے اعلان کیا۔ فان شوارز گورنمنٹ کی طرف سے ہندوستان کی لوہے اور کوئلے کی کانوں کے دریافت کرنے پر مقرر تھا۔ اس جگہ کے قریب ایک جگہ وارورا ہے۔ وہاں کوئلہ نکلتا ہے۔ فان شوارز نے لکھا۔ کہ اس کوئلے سے یہ لوہا صاف نہیں ہو سکتا۔ جب جمشید ٹاٹا نے فان شوارز کی رپورٹ پڑھی۔ تو اسے اطمینان نہ ہوا۔ اور اس نے مختلف علمی رسالوں میں اشتہار دئے۔ کہ جو شخص وارورا کے کوئلے سے لوہارا کے لوہے کو صاف کرنیکا طریقہ نکالے گا۔ اسے انعام دیا جائیگا۔ اگرچہ کوئی کامیاب طریقہ نہ ملا۔ مگر مسٹر ٹاٹا نے چند آدمیوں میں انعام تقسیم کر دیا۔ اب مسٹر ٹاٹا نے سر جان مارس سے جو صوبہ وسطی کا چیف کمشنر تھا۔ درخواست کی کہ اسے لوہارا کے لوہے کو وارورا کے کوئلہ سے صاف کرنے کی اجازت دی جائے۔ اور واردہا جنکشن سے وارورا تک ۴۵ میل کی ریل اس کارخانے کی خاطر بنائی جائے۔ گورنمنٹ نے ٹاٹا کی بات کو منظور نہ کیا۔ اور یہ تجویز بیس سال تک ملتوی رہی۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں مسٹر ٹاٹا وزیر ہند لارڈ جارج ہملٹن سے لنڈن میں انسٹیٹوٹ آف سائنس کے متعلق ملا۔ اور اثناء گفتگو میں اس نے یہ ذکر کرتے ہوئے کہ ہندوستان

میں کس طرح صنعتی ترقی حکام کی مخالفت کی وجہ سے رک جاتی ہے اپنا بیس سال پہلے کی صنعت قائم کرنے کا قصہ بیان کیا۔ مسٹر ٹاٹا نے کہا۔ کہ جس وقت میں نے پہلی کوشش کی تھی۔ اس وقت مجھے روپیہ کمانے کی آرزو تھی۔ مگر اب خدا نے مجھے ضرورت سے زیادہ دیدیا ہے۔ مجھے اگر لوہے کے نکالنے کا خیال ہے۔ تو صرف ملک کی بہتری کی خاطر ہے۔ لارڈ جارج ہملٹن نے کہا۔ کہ لارڈ کرزن یقیناً تمہاری امداد کریں گے۔ مسٹر ٹاٹا نے کہا۔ کہ وائسرائے آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ اگر اب میں کام شروع کردوں۔ تو جس وقت وہ پورا ہوگا۔ ممکن ہے۔ کسی ایسے شخص سے مجھے واسطہ پڑے۔ جو بالکل بے رخی سے پیش آئے۔ لارڈ جارج ہملٹن نے پھر یقین دلایا اور گورنمنٹ ہند کو ایک خط لکھا۔ جس میں اس نے لکھا۔ کہ گورنمنٹ ہند جس قسم کی بھی امداد کرے گی۔ میں اس کا موید ہونگا ہندوستان میں واپس آکر مسٹر ٹاٹا نے لوہارا اور پیپل گاؤں سے لوہا نکالنے کیلئے لائسنس کی درخواست دی۔ درخواست منظور ہو گئی۔ مئی ۱۹۰۲ء میں مسٹر ٹاٹا لوہے کے کام کے متعلق وزیر ہند سے دوبارہ گفتگو کرنے کیلئے گیا۔ چار پانچ مہینے کے انتظار کے بعد وزیر ہند کی ملاقات ہوئی۔ اور وہاں سے ٹاٹا امریکہ گیا۔ وہاں وہ مسٹر ارسکائن ریمزے اور دوسرے لوہا اور فولاد بنانے والوں سے ملا۔ اور لوہا اور فولاد بنانے کے مختلف طریقوں کا ملاحظہ کرتا رہا۔ ادھر ہندوستان میں مسٹر ٹاٹا کا بیٹا دوراب ٹاٹا اس کام کے ابتدائی انتظامات میں معروف تھا۔ شکاگو سے مسٹر ٹاٹا کلیولینڈ واقعہ اوہیو میں گیا۔ اور یہ اس کے سفر امریکہ کا اصلی مقصد تھا کلیولینڈ تمام دنیا میں سب سے بڑی کچے لوہے کی منڈی ہے۔ اور یہاں کثیر مقدار میں لوہے اور فولاد کی اشیاء بنتی ہیں بنیڈر ٹاٹا نے مسٹر ٹاٹا کا خیر مقدم کیا۔ اور بیس سے زیادہ ماہرین کو ان کی ملاقات

کے لئے بلایا۔ ان کے ساتھ مسٹر ٹاٹا کئی گھنٹے تک ہندوستان والی تجویز پر بحث کرتے رہے۔ یہاں سے مسٹر ٹاٹا پٹس برگ گئے پٹس برگ امریکہ کے شہروں میں لوہے کی صنعت کے لئے درجہ اوّل پر ہے۔ تمام ملک کی لوہے کی صنعت میں سے پچاس فیصدی سے زیادہ سامان یہاں تیار ہوتا ہے۔ یہاں مسٹر ٹاٹا کو وہ مشورہ اور امداد ملی۔ جس کی وہ تلاش میں تھا۔ مسٹر کینیڈی۔ جو لین کینیڈی ساہلن اینڈ کمپنی کا ناظم اعلیٰ ہے۔ مسٹر کینیڈی دنیا بھر کے اعلیٰ ترین ماہران فلزیات میں سے ہے۔ اور اس کی شہرت تمام اقوام میں ہے مسٹر ٹاٹا نے اس کے سامنے اپنی تجویز پیش کی۔ اس نے صلاح دی۔ کہ کچی دھات اور مقامی حالات کی ابھی علمی تحقیقات نہیں ہوئی۔ اور جب تک پوری تحقیقات نہ کرلی جائے۔ کروڑوں روپے کا خرچ کرنا خلاف دانش ہوگا۔ ابتدائی تحقیقات پر بھی بہت خرچ ہوگا۔ اگر آپ خرچ اٹھا سکتے ہیں۔ تو مسٹر پیرن سے بہتر انجنیر اس کام کیلئے کوئی نہیں۔ مسٹر ٹاٹا نیویارک میں آکر مسٹر پیرن سے ملے۔ مسٹر پیرن نے معذوری ظاہر کی۔ اور صلاح دی۔ کہ مسٹر ویلڈ کو لیجائیں۔

مسٹر ویلڈ نے جانے کا اقرار کرلیا۔ اور اب مسٹر ٹاٹا واپس انگلستان آئے۔ انگلستان میں چار دن رہ کر مسٹر ٹاٹا برقی پلانٹ کیلئے جرمنی گئے اور ٹریسٹ سے بمبئی کے جہاز پر سوار ہوئے۔ بمبئی پہنچتے ہی مسٹر ٹاٹا نے اپنے بیٹے دوراب ٹاٹا کو تاکید کی۔ کہ لوہے کے کام پر زیادہ توجہ کرے۔ اس وقت کے بعد یہ کام زیادہ تر دوراب ٹاٹا کے ہاتھ میں رہا۔ مسٹر جمشید ٹاٹا کی صحت پہلے ہی سے کمزور ہوچکی تھی۔ اس لئے وہ سوائے مشورہ دینے کے اور کوئی حصہ نہ لے سکے۔

اپریل ۱۹۰۳ء میں مسٹر ویلڈ (امریکن انجنیر) اور دوراب ٹاٹا نے صوبجات وسطی میں دورہ کرنا شروع کیا۔ اس سفر میں ان کو بہت سی تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ اپریل مئی اور جون کی شدت

کی گرمی میں ریل سے دور چھکڑوں میں سفر کرنا پڑتا تھا۔ بعض اوقات خوراک کے لیئے بھی تکلیف ہوتی تھی جنگلی جانوروں کا ڈر الگ تھا۔ پانی بہت کم تھا۔ بعض اوقات سوڈا واٹر میں جو چھکڑوں میں ساتھ رکھتے تھے۔ چائے بنا کر پینی پڑتی تھی۔ مسٹر ویلڈ ہر جگہ کا علمی امتحان احتیاط اور صبر کے ساتھ کرتے جاتے تھے۔ ادھر لارڈ کرزن اس دیر پر بے صبر ہو رہا تھا کہ ٹاٹا نے لائسنس لیکر کیا کیا ہے۔ ۱۹۰۳ء میں سرارنسٹ کیبل ہندوستان میں آیا۔ اور لارڈ کرزن نے اس کو ہندوستان میں لوہا نکالنے کی طرف توجہ دلائی۔ اس نے جبل پور کے نواح میں لوہے کی کانوں کا امتحان کروایا۔ مگر جبل پور کے علاقے میں کام کے لائق لوہا نہ ملا۔ اسی طرح اور لوگ بھی مسٹر ٹاٹا کے اردگرد علاقے میں لوہے کے لائسنس لیکر تلاش میں مصروف تھے۔ مسٹر ویلڈ کو چندا میں مناسب قسم کا لوہا مل گیا۔ اب وہ کوئلے اور پانی کی تلاش کرنے لگا۔ واروڑا کا کوئلہ ختم ہونے کے قریب تھا۔ جب کہیں پانی اور کوئلہ نہ ملا۔ تو انہوں نے مجبور ہو کر فیصلہ کیا۔ کہ ہندوستان میں لوہے اور فولاد کا کام جاری کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس مایوسی میں تمام لوہے کے لائسنس سوائے لوہارا کے لائسنس کے واپس کر دئے گئے۔ اس وقت ایک ایسا اتفاق ہوا۔ جن سے پھران کے حوصلے بندھ گئے۔ سر دوراب ٹاٹا ناگپور چیف سکرٹری کو دیکھنے کیلئے گیا۔ تاکہ اسے اپنے فیصلے سے اطلاع دیں۔ چیف سکرٹری باہر گیا ہوا تھا۔ سر دوراب ٹاٹا انتظار کا وقت کاٹنے کیلئے سکرٹرائٹ کے سامنے عجائب گھر میں چلا گیا۔ اور وہاں اس کی نظر ایک نقشے پر پڑ گئی۔ جس میں چاندا سے ایک سو چالیس میل کے فاصلے پر ضلع ڈرگ پر سیاہ رنگ کیا ہوا تھا۔ جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ یہاں لوہا پایا جاتا ہے۔ اس نے مسٹر ویلڈ کو جو ساتھ تھا۔ نقشہ دیکھنے کے لئے بلایا۔ عجائب گھر میں ایک الماری میں ڈرگ کے علاقے کے کچے لوہے کا بہت عمدہ نمونہ

پڑا تھا۔ سر دوراب ٹاٹا چیف سکرٹری سے ملا۔ اور اس سے بیان کیا کہ جب تک قریب کوئلہ نہ ملے۔ چاندا کے لوہے کو صاف نہیں کر سکتے۔ ضمناً اس نے ڈرگ کے بارے میں پوچھا۔ جیولاجیکل سروے کے ریکارڈ دیکھنے سے معلوم ہوا۔ کہ مسٹر پی این بوس نے جو سروے کے کام پر متعین تھا۔ ۱۸۸۷ء میں لکھا تھا۔ کہ اس علاقے میں لوہا بہت ہے۔ مگر اس کی تحقیقات سرسری سی تھی۔ اور اس کی رپورٹ مدت سے فراموش ہو چکی تھی۔ مسٹر ویلڈ اس علاقے کے دیکھنے کے لئے گئے۔ ایک گاؤں پہنچے۔ تو انہوں نے دیسی طریق سے لوگوں کو لوہا بناتے ہوئے دیکھا۔ ان سے پوچھا۔ کہ یہ لوہا تم کہاں سے لیتے ہو۔ وہ اسے ایک پہاڑی پر لے گئے۔ جو قریباً تین سو فٹ اونچی تھی۔ مسٹر ویلڈ اس پہاڑی پر چڑھا۔ تو حیران ہوا۔ کہ اس کے چلنے سے اس طرح آواز آتی تھی۔ جیسے کسی دھات پر چلنے سے آتی ہے۔ یہ واقعی خالص لوہے کی پہاڑی تھی۔ ناگپور واپس پہنچ کر اس نے دھالی اور راجھارہ کی پہاڑیوں کے لائسنس کیلئے درخواست دی اور درخواست منظور ہو گئی۔ اس پہاڑی کے کچے لوہے کا تجزیہ کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ اس میں ۶۵½ فی صدی خالص لوہا ہے۔ اب تک دنیا میں زیادہ سے زیادہ فی صدی مقدار جو لوہے کی نکلی ہے۔ وہ ستر فی صدی ہے۔

مسٹر پیرن (امریکن انجنیر) نے بعد میں جب دھالی اور راجھارہ کو دیکھا۔ تو کہا۔ کہ یہ دنیا کی فلزی عجائبات میں سے ہیں۔ مگر کوئلہ کی مشکل حل نہ ہوئی۔ آخر مسٹر پیرن کی صلاح سے یہ قرار پایا۔ کہ جھاریہ بنگال کی کانوں کے کوئلہ کے بغیر کام نہیں بنے گا۔ آٹھ دس ٹن جھاریہ کا کوئلہ اور دھالی اور راجھارہ کا لوہا جرمنی اور امریکہ بھیجا گیا۔ وہاں اس کوئلہ سے اس لوہے کو صاف کر کے دیکھا گیا۔ اور نتائج قابل اطمینان نکلے۔ پانی کا سوال باقی رہ گیا۔ مسٹر ویلڈ نے دریا مہاندی

کا کنارہ انتخاب کیا۔ جو کٹک کے نیچے خلیج بنگال میں گرتی ہے۔ سمبل پور کے قریب ایک جگہ بھی پسند کی گئی۔ پانی کے علاوہ سمبل پور میں یہ فائدہ تھا۔ کہ کوئلے اور لوہے کی کانوں سے برابر فاصلے پر واقعہ تھا۔ اس لئے ٹاٹا کا کیمپ دریا مہاندی کے کنارے پر لگایا گیا۔ اور مسٹر پیرن امریکہ سے دوبارہ آئے۔ تاکہ جو تحقیقات کی جا چکی تھی۔ اس کی صحت وسقم جانچیں۔ اور کارخانے کے متعلق آخری تجویز تیار کریں۔ اس وقت تک ان ابتدائی تحقیقاتوں پر تیس ہزار پونڈ خرچ ہو چکا تھا۔ مسٹر جمشید ٹاٹا فوت ہو گیا تھا مگر اس کا بیٹا سر دوراب ٹاٹا اور نائب مسٹر بی جے پادشاہ عزم بالجزم کئے ہوئے تھے۔ کہ اس کے عظیم الشان خیال کو تکمیل تک پہنچائیں گے۔ ایک دن ٹاٹا کی فرم کو مسٹر پی این بوس کا خط ملا۔ یہ وہی پی این بوس تھا۔ جس کے نام سے وہ ڈرگ کے ضلع کے لوہے پر رپورٹ لکھنے کے باعث واقف تھے۔ مسٹر بوس نے لکھا۔ کہ اب وہ راجہ مور بھانج کا ملازم ہے۔ مور بھانج صوبہ بہار کی ایک ریاست ہے۔ مسٹر بوس کو مہاراجہ نے اپنی ریاست کی کانیں دریافت کرنے کے لئے بلایا تھا۔ مسٹر بوس نے مہاراجہ سے مشورہ کرکے ٹاٹا کو لکھا۔ کہ میں نے ریاست میں بڑی مقداروں میں لوہا دریافت کیا ہے۔ آپ معائنہ کرنے کیلئے آئیے۔ یہ جگہ بنگال کی کوئلے کی کانوں کے بھی قریب تھی۔ مسٹر پیرن مسٹر ویلڈ اور سر دوراب ٹاٹا مور بھانج کے علاقے میں گئے۔ مسٹر پیرن مسٹر ویلڈ اور مسٹر بوس جنگلوں اور پہاڑوں میں سے ہوتے ہوئے بڑی وقت کے بعد گورمشنی پہاڑی پر پہنچے۔ ان کو وہاں کثیر تعداد میں لوہا ملا۔ اگرچہ یہ لوہا ایسا نہیں تھا۔ جیسا کہ دھالی اور راجھارہ کا مگر موقع کے لحاظ سے زیادہ اچھی جگہ پر تھا۔ علاوہ کانوں کے یہاں سینکڑوں ایکڑ زمین لوہے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ جس کے جمع کرنے پر کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ مہاراجہ کے ساتھ محصول کا تصفیہ

ہوا۔ اور بیس میل مربع کا اجارہ لے لیا گیا۔ اب جگہ کی تلاش ہونے لگی۔ جہاں کارخانہ بنایا جائے۔ مسٹر پیرن اور مسٹر ویلڈ نے بنگال ناگپور ریلوے پر سینی ایک جگہ ہے۔ اس کا انتخاب کیا۔ یہ گورو میشنی پہاڑی سے ساٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ گورنمنٹ نے گورو میشنی پہاڑی تک ریل بنانے کا اقرار کر لیا۔ اس کے علاوہ گورنمنٹ نے بیس ہزار ٹن ریلیں یورپ کی آمدہ ریلوں کی شرح پر دس سال تک خریدنے کا اقرار کیا۔ اب سر دوراب ٹاٹا اور مسٹر پادشاہ نے لندن میں سرمایہ جمع کرنے کی کوشش کی۔ یہ ۱۹۰۶ء کا ذکر ہے۔ ایک سال سے زیادہ اس کوشش پر صرف ہوا۔ مگر روپیہ فراہم نہ ہو سکا۔ ہندوستان میں ۱۹۰۷ء میں سودیشی کا زور و شور تھا۔ سر دوراب ٹاٹا نے ہندوستان کے لوگوں سے اپیل کرنے کا ارادہ کیا۔ بہت سے لوگ کہتے تھے۔ کہ ناکامی ہو گی۔ مگر تین ہفتے میں سولہ لاکھ تئیس ہزار پونڈ جمع ہو گیا۔ یہ تمام روپیہ آٹھ ہزار ہندوستانی سرمایہ داروں کی طرف سے تھا۔ یہ روپیہ تعمیر کے لئے کافی تھا۔ جب کام شروع کرنے کیلئے چار لاکھ پونڈ کی اور ضرورت پڑی۔ تو یہ رقم اکیلے مہاراجہ گوالیار سے مل گئی۔ جب روپیہ جمع ہو گیا۔ تو تعمیر کا کام مسمز جولین کینیڈی ساہلن اینڈ کمپنی امریکہ کے سپرد ہوا۔ جب مسٹر ساہلن ۱۹۰۸ء میں ہندوستان پہنچا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ کارخانے کی جگہ سینی سے ایک اور گاؤں میں جس کا نام ساکچی ہے، اور جو بیس میل کے فاصلے پر ہے۔ بدل دی گئی ہے۔ یہ جگہ کالی ماٹی کے ریلوے اسٹیشن سے اڑھائی میل کے فاصلے پر ہے۔ ساکچی کا نام اب جمشید ٹاٹا کے نام پر جمشید پور رکھا گیا ہے۔ اور کالی ماٹی کا نام ٹاٹا نگر رکھا گیا ہے۔ تبدیلی کی وجہ سے ایک تو سینی میں پانی کی کمی تھی۔ اور دوسری زمین کی قلت۔ گورنمنٹ نے کالی ماٹی سے گورو میشنی تک ریل بنانا منظور کر لیا۔ یہ فاصلہ چالیس

میل تھا۔ اب تعمیر کا کام شروع ہؤا۔ اور ۱۹۱۱ء میں ختم ہؤا۔ دسمبر ۱۹۱۱ء میں پہلا لوہا تیار ہو کر نکلا۔ جب کام شروع ہؤا۔ تو لوہا صاف کرنے والے امریکن تھے۔ فولاد بنانے والے جرمن اور ریل بنانے والے انگریز۔ ابتدا میں کل سرمایہ دو کروڑ ۳۱ لاکھ روپیہ تھا۔ ۱۹۱۸ء میں دس کروڑ باون لاکھ کر دیا گیا۔ قرضے سمیت کل سرمایہ بارہ کروڑ ستہتر لاکھ ہے ۵۲۴ اس وقت کام کرنے والے دو تین سو یورپین کاریگر ہیں۔ مگر اس سال سے کمپنی نے ساٹھ روپیہ ماہوار کا وظیفہ دے کر ہندوستانی نوجوانوں کو جو ایف ایس سی تک تعلیم حاصل کر چکے ہوں۔ دو سال میں کام سکھانیکا انتظام کیا ہے

ہم نے اس داستان کو طول اس لئے دیا ہے۔ کہ ہندوستان کی آئندہ ترقی کے لئے یہ ہر رنگ میں سبق آموز ہے۔ اور آئندہ کوشش کرنے والوں کیلئے نمونے کا کام دے گی۔ اس سے ان مشکلات کا بھی علم حاصل ہوگا۔ جو طبعی طور پر ہر صنعتی ترقی کے راستے میں پیش آتی ہیں۔ اور اس قصے میں ان لوگوں کا بھی جواب ہے۔ جو یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ موجودہ سیاسی حالات کے ماتحت کسی قسم کی صنعتی ترقی ہونی ممکن نہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگا۔ کہ سب سے بڑی ضرورت ہر قسم کی ترقی کے لئے انسانی علم اور ہمت ہے۔ ۱۹۱۳ء میں لوہے کی اشیاء کی قیمت جو غیر ممالک سے ہندوستان میں آئیں۔ ۲۵ کروڑ روپیہ تھی۔ ان میں ٹین کی چادریں۔ فولاد کی چادریں۔ ریل کے کارخانوں کی مشینیں۔ دوسری اقسام کی مشینیں۔ عمارتی لوہا۔ موٹر کاریں۔ برقی سامان زراعتی سامان۔ ٹائپ رائٹر۔ بائسکل وغیرہ شامل ہیں۔ یہ چیزیں ہندوستان

---

۵۲۴ مفصل حالات کے لئے دیکھو۔ آئرن اینڈ سٹیل ان انڈیا مصنفہ لووات فریزر۔

میں نہیں بن سکتیں۔ مذکورہ بالا دو کارخانوں میں صرف ریلیں اور سادہ چیزیں بنتی ہیں۔ ہندوستان میں انجن نہیں بن سکتے۔ میخیں اور پیچ بنانے کی مشین نہیں۔ برقی سامان نہیں بن سکتا۔ لوہے کی زنجیریں نہیں بن سکتیں۔ فولاد کے سپرنگ نہیں بن سکتے۔ ہل اور بیلچے بھی باہر سے آتے ہیں۔ اور بڑھئی کے اوزار بھی باہر سے بن کر آتے ہیں۔ اگر ایسی چیزوں کی تلاش کی جائے۔ جو ہندوستانی سرمایہ سے غیر ملکی کاریگروں کی امداد کے بغیر بنتی ہیں۔ تو ہمیں مایوسی سے یہ کہنا پڑے گا۔ کہ جو کپڑا یا لوہا اس وقت ہندوستان میں بن رہا ہے۔ وہ بھی حقیقت میں یورپ میں بنتا ہے۔ صرف ہندوستان سے یورپ کے کاریگروں نے جگہ اور کارخانے کرایہ پر لے رکھے ہیں۔ ان دو کمزوریوں میں سے کہ ملک کے کارخانوں کا سرمایہ غیر ملکی ہو۔ بڑی کمزوری یہ ہے۔ کہ ہنرمند لوگ جن کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ اپنے ملک میں نہ ملیں۔ اگر ملکیت کے سوال پر عمیق نظر کی جائے۔ تو کسی کارخانے کے حقیقی مالک وہی لوگ ہیں۔ جو اس کو جاری کر سکتے ہیں۔ یا بند کر سکتے ہیں۔ سرمایہ دار ایک شخص یا دو شخصوں کو نکال سکتا ہے۔ مگر کارخانے اسی قوم کا قبضہ رہتا ہے۔ جس قوم کے کاریگر ہیں۔ ہندوستان کی صنعتی حالت کا صحیح اندازہ ۲۱-۱۹۲۰ء کی درآمد برآمد کی رپورٹ سے جو گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف چھپی ہے۔ ہو سکے گا۔ اس میں ۳۱ مارچ ۱۹۲۰ء سے ۳۱ مارچ ۱۹۲۱ء تک جو مال ہندوستان سے باہر گیا ہے۔ یا باہر سے ہندوستان میں آیا ہے۔ تفصیل کے ساتھ درج ہے۔ لاکھ کی رقمیں چھوڑ کر اس سال میں کل مال جو تجار کی معرفت ملک میں داخل ہوا۔ تین ارب پینتیس کروڑ روپے کی مالیت کا تھا۔ اس کے علاوہ ساڑھے گیارہ کروڑ کا مال گورنمنٹ کی معرفت آیا۔ اس غیر ملکی مال میں سے بائیس کروڑ کا مال دوسرے ممالک

میں بھیج دیا گیا۔ اس حساب سے کل غیر ملکی مال جو ہندوستان میں خرچ ہوا۔ تین ارب چوبیس کروڑ تھا۔ اس میں سے دو ارب ستانویں کروڑ کی مصنوعات تھیں۔ اور بیس کروڑ کی غیر مصنوعہ خام اشیاء ان کے علاوہ سات کروڑ کے قریب ڈاک میں اشیاء آئیں۔ قیاس چاہتا ہے۔ کہ یہ اشیاء اکثر حصہ مصنوعہ ہوں گی۔ مگر نصف مصنوعہ اور نصف غیر مصنوعہ بھی ہوں۔ تو بھی تین ارب سے زیادہ کا مصنوعہ سامان ہندوستان میں باہر سے آیا۔ اور تیئیس کروڑ کے قریب غیر مصنوعہ خام اشیاء آئیں۔ گویا قریباً سات فیصدی خام اشیاء تھیں۔ اور ترانوے (۹۳) فیصدی مصنوعات تھیں۔ ہندوستان کی محتاجی کی انتہا اس تین ارب روپے سے ظاہر ہوتی ہے۔ ان مصنوعات میں سے قیمت کے لحاظ سے سب سے اوّل کپڑا ہے۔ اس سال میں ہندوستان میں ایک ارب اٹھارہ کروڑ سے زیادہ کے ریشمی۔ اونی۔ سوتی سب اقسام کے کپڑے اور سوت آئے۔ اس میں سے جو باہر ممالک میں بھیج دیا گیا۔ وہ نکال کر ایک ارب چودہ کروڑ کا کپڑا ملک میں رہا۔ اس کے علاوہ تیار شدہ لباس ملبوسات تین کروڑ پینسٹھ لاکھ کی ملک میں رہیں۔ اس کو شامل کر کے ایک ارب سترہ کروڑ سے زیادہ کا غیر ملکی کپڑا اور لباس خرچ ہوا۔

لوہے۔ فولاد اور دوسری غیر آہنی اشیاء۔ چھری چاقو۔ اوزار وغیرہ اُنسٹھ (۵۹) کروڑ کے آئے۔ مشینیں پچیس کروڑ کے قریب آئیں۔ ریل کا سامان ساڑھے سولہ کروڑ کا آیا۔ بائسکل اور موٹر کار پونے پندرہ کروڑ کے آئے۔ پانچ کروڑ کے قریب دوائیں آئیں۔ ساڑھے پانچ کروڑ کے رنگ خرچ ہوئے۔ چار کروڑ سے زیادہ کے چینی اور شیشے کے برتن آئے۔ ڈیڑھ کروڑ کے قریب چمڑا اور چمڑے کی مصنوعات خرچ ہوئیں۔ ساڑھے نو (۹½) کروڑ کے قریب کا غذ اور سٹیشنری وغیرہ آیا۔ بسکٹ کیک ٹین کا گوشت وغیرہ قریباً ساڑھے تین کروڑ

کے آئے۔ شراب چار کروڑ سے زیادہ کی خرچ ہوئی۔ بارہ کروڑ (۱۲) کروڑ
سے زیادہ کی کھانڈ باہر سے آکر خرچ ہوئی۔ پونے تین کروڑ سے
کے صرف سیگرٹ و سیگار خرچ ہوئے۔

اس کے مقابلے میں جو اشیاء غیر ممالک کو بھیجی گئیں۔ ان کی کل قیمت دو ارب تینتالیس کروڑ (۲۴۳ کروڑ) تھی۔ اس میں سے گورنمنٹ کے سٹور شامل کرکے (۹۵) پچانوے کروڑ کی مصنوعات سمجھنی چاہئیں۔ اور ایک ارب سینتالیس سے زیادہ کی خام پیداوار اس میں سے باسٹھ (۶۲) کروڑ سے زیادہ کی کپاس اور کپڑا بنانے کی اشیاء گئیں پچیس کروڑ سے زیادہ کا غلہ گیا۔ بارہ (۱۲) کروڑ سے زیادہ کی چاء گئی۔ قریباً سترہ کروڑ (۱۷ کروڑ) کے تخم گئے۔ پانچ کروڑ سے زیادہ کے خام چمڑے گئے۔ مصنوعہ اشیاء میں سے پونے چار کروڑ سے زیادہ کی کیمیاوی اشیاء ہیں۔ یورپ میں ادویات بنانے کے کام آتی ہیں۔ اس لئے ان کو بھی خام پیداوار میں رکھنا زیادہ مناسب ہوگا۔ مثال کیلئے ہینگ۔ کافور سنکونا کا چھلکا ہیں۔ رنگوں کی ذیل میں ایک کروڑ سے زیادہ رقم ہے۔ یہ بھی غالباً مصنوعات میں شمار نہیں ہونے چاہئیں۔ کیونکہ ان میں وہ اشیاء ہیں۔ جن سے یورپ میں جاکر رنگ بنایا جاتا ہے۔ بہتر (۷۲) کروڑ روپے سے زیادہ کا کپڑا ہے۔ جو ہندوستان سے بیرونجات میں گیا۔ اس میں ۵۲ کروڑ کے قریب جیوٹ کا کپڑا شامل ہے۔ جس کی بوریاں بنتی ہیں۔ اس کام میں نہ ہندوستانی سرمایہ داروں کا کچھ دخل ہے۔ اور نہ کاریگروں کا قریباً کل کے کل کارخانے کلکتہ میں واقعہ ہیں۔ اور یورپین لوگوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اس لئے اسکی مصنوعات کو بھی انگلستان کی مصنوعات سمجھنا چاہیئے۔ ہندوستانیوں کا جس چیز میں دخل ہے۔ وہ خام پیداوار ہے۔ باقی میں سے اٹھارہ کروڑ سے کچھ زیادہ کے سوتی کپڑے ہیں۔ جن میں سے اکثر ہندوستانی سرمایہ داروں کے

کارخانوں میں بنتے ہیں۔ مگر اعلیٰ رتبہ کے کاریگر جوان کارخانوں کو چلاتے [illegible] اکثر یورپین ہیں۔

بعض اشیاء کی درآمد و برآمد کا مقابلہ سبق آموز ہے۔ ربڑ کی مصنوعات اس سال میں دو کروڑ باون لاکھ سے زیادہ کی آئیں۔ خام ربڑ باہر سے تین ہزار روپے کے قریب آئی۔ اس کے مقابلے میں ایک کروڑ پچپن لاکھ (۱۵۵ کروڑ) کی خام ربڑ ہندوستان سے باہر گئی اور ربڑ کی مصنوعات صرف چوالیس ہزار (۴۴ ہزار) کی باہر گئیں گویا ربڑ جو اس کثرت سے اس ملک میں پیدا ہوتی ہے۔ اس سے کارآمد اشیاء بنانے کا ہنر ملک میں ہے ہی نہیں۔ حالانکہ ربڑ کی بنی ہوئی اشیاء کی ملک میں اتنی کھپت ہے۔

چھیالیس ۴۶ لاکھ کے صرف بسکٹ اور کیک ولایت سے آتے ہیں ستر لاکھ سے زیادہ کی پیٹنٹ خوراک آتی ہے۔ چوالیس لاکھ (۴۴ لاکھ) کا ڈبوں میں دودھ کا ست بند ہو کر آتا ہے۔ سات لاکھ سے زیادہ کی چٹنیاں ہی آتی ہیں۔ حالانکہ یہ چیز اور اس کا نام دونوں ہندوستانی ایجاد ہیں۔ ایک کروڑ سے زیادہ کے بوٹ آئے۔ اٹھارہ لاکھ سے زیادہ کے برش بنانے کے بال ملک سے باہر بھیجے گئے۔ اور سترہ (۱۷) لاکھ سے زیادہ کے برش باہر سے بن کر آئے۔ ایک کروڑ، ۷ لاکھ کی دیاسلائیاں باہر سے آئیں۔ ایک کروڑ چالیس لاکھ کا صابن آیا۔ چاء تو اس ملک میں پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ بھی انگریزوں کی کوشش سے مگر اس چاء کو بند کر کے باہر بھیجنے کیلئے جن صندوقوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ انگلستان۔ یورپ اور جاپان جیسے ممالک سے آتے ہیں۔ چنانچہ سال زیر غور میں ایک کروڑ سے زیادہ کے لکڑی اور لوہے کے صندوق ان ممالک سے بن کر آئے۔ لوہے کا کام اگر سمجھیں کہ اس ملک میں مشکل سے بنتا ہے۔ تو لکڑی کا کام تو آسانی سے بن سکتا ہے۔ مگر ان صندوقوں میں سے اٹھانویں (۹۸) لاکھ سے

زیادہ کے صندوق لکڑی کے تھے۔ ۴۳ لاکھ کا خام تمباکو باہر جاتا ہے اور اس کے مقابل میں پونے تین کروڑ کے سگار سگرٹ باہر سے آتے ہیں۔ جتنی اشیاء باہر سے آتی ہیں۔ ان میں سے دو ارب بائیس کروڑ کی سلطنت برطانیہ میں سے آتی ہیں۔ اور اس کا اکثر حصہ خاص انگلستان میں سے آتی ہیں۔ جتنی اشیاء ملک سے باہر گئیں۔ ان میں سے ایک ارب سے زیادہ کی سلطنت برطانیہ میں گئیں۔ اور اکثر حصہ خاص انگلستان میں گیا۔

آجکل کے ہندوستانی مصنوعات کچھ نظر پہ چڑھتی ہیں۔ تو وہ اٹھارہ کروڑ کا کپڑا ہے۔ مگر اس میں بھی خامی یہ ہے۔ کہ کاریگر انگریز ہیں

چوتھا باب

صنعتی پستی کے متعلق گورنمنٹ اور اہل ملک کی ذمہ داری

اس باب میں ہمارے سامنے سب سے اہم سوال درپیش ہے۔ وہ یہ کہ ہندوستان نے اب تک یورپین صنعت کو حاصل کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ اور کیوں یورپین طریق پر تمام ضروری اشیاء اور مشینیں اپنے ملک میں بنانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ انگریزی تعلیم کو جاری ہوتے ایک سو برس ہو گیا ہے۔ اور ابھی تک ملک میں وہ ہنر جاری نہیں ہوئے جن کے لئے انگریزی زبان ذریعہ تھی۔ یہ ایک بڑی بھاری فروگذاشت ہے۔ جس کی ذمہ واری گورنمنٹ اور اہل ملک دونوں پر عائد ہوتی ہے۔ اگر گورنمنٹ اور اہل ملک پوری کوشش کرتے۔ تو ہم اس وقت کس حال میں ہوتے۔ اگر صرف گورنمنٹ ہی ابتدا سے کوشاں ہوتی۔ اور اہل ملک متوجہ نہ ہوتے تو پھر کس حالت پر پہنچتے۔ یہ بڑے ضروری سوال ہیں۔ ان کا صحیح جواب دینا انسانی علم سے باہر ہے۔ مگر اتنی بات یقینی ہے۔ کہ کوئی ایک فریق بھی پورے طور سے کوشش کرتا۔ تو حالت اس وقت سے بہتر ہوتی۔ جتنی کوشش کی گئی ہے۔ اس کا ثمرہ مل چکا ہے۔ اب ہم علی الترتیب ہر فریق کی ذمہ واری کا ذکر کرتے ہیں۔

گورنمنٹ کی پالیسی کے متعلق جو رائے خود سرکاری حکام کی تحریر میں آئی ہو۔ اس پر شبہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہم انڈین انڈسٹریل کمیشن ۱۹۱۸ء کی رپورٹ سے اس پالیسی کے متعلق چند فقرے نقل کرتے ہیں۔ تجارتی اغراض کی وجہ سے "ایسٹ انڈیا کمپنی" کی ابتدا سے ہندوستان کی ان صنعتوں کو ترقی دینے کی طرف توجہ

تھی۔ جو اسے انگلستان کے لئے درکار تھیں۔ مثال کے طور پر سوتی اور ریشمی کپڑے کی صنعت کی روپے سے امداد کی جاتی تھی۔ اگرچہ اس پالیسی کی انگلستان کے صناعوں نے مخالفت کی۔ جو ایک وقت میں ایسے زبردست تھے۔ کہ انہوں نے مطالبہ کیا۔ کہ یہ پالیسی ملتوی کردی جائے۔ اور کمپنی ہندوستان سے انگلستان کی صنعتوں کے لئے خام اشیاء بھیجنے پر اپنی کوششوں کو خرچ کرے۔ کمپنی کی قدیم پالیسی کا اثر کمپنی کے بعد ہی رہا۔ اور گورنمنٹ نے بعد میں جو کوششیں کیں۔ وہ اسی اثر کے ماتحت کیں۔ مگر چونکہ انگلستان اور ہندوستان میں لیسے فیر (عدم مداخلت) کے خیالات عام طور پر مقبول ہو گئے تھے۔ یہ ٹوٹی پھوٹی کوششیں اور بھی کم ہو گئیں۔ پہلی صنعتی ترقی کی عام کوشش اس رنگ میں ہوئی۔ کہ نہایت ناکمل صنعتی تعلیم کا انتظام کر دیا گیا۔ اور صنعتی اور تجارتی واقفیت مہیا کر کے شائع کر دی گئی۔ اس پالیسی کا اظہار ۱۸۸۴-۸۵ء کی کلکتہ کی نمائش کے قائم کرنے میں ہوا۔ جس کی وجہ سے کلکتہ میں تجارتی عجائب گھر قائم کر دیا گیا۔ جو اب انڈین میوزم کا ایک حصہ ہے۔ سر جارج برڈ وڈ کی کتاب ہندوستان کے فنون پر۔ لنڈن کی ۱۸۸۶ء کی ہندوستان اور نوبستیوں کی نمائش۔ اور ۱۸۹۰ء میں صوبجات کی صنعتوں پر رسالے اور ۱۹۰۴ء سے جیولاجیکل سروے کی معدنیات کے تجارتی استعمال کی طرف توجہ۔ یہ چند غیر سلسلہ وار کوششیں ہیں۔ جو صنعت کی ترقی کے لئے کی گئیں۔ [۱] مگر جو کچھ بھی ہوا۔ وہ چند ایک دور اندیش افسروں کی وجہ سے ہوا۔ نہ کہ گورنمنٹ کی عام فیصلہ شدہ پالیسی کے مطابق۔ اگرچہ ۱۹۰۵ء میں تجارت اور صنعت کا محکمہ الگ کر دیا گیا تھا۔ مگر اس محکمے نے وہ صورت اختیار نہ کی۔ جو لارڈ کرزن

---

[۱] انڈین انڈسٹریل کمیشن رپورٹ ۱۹۱۸ء ص ۷۵

کا منشاء تھا"۔ [52] ۱۹۰۶ء میں نینی تال میں ایک کانفرنس ہوئی۔ جس کے فیصلوں کی رو سے صوبجات متحدہ کی گورنمنٹ نے ایک صنعت و حرفت کا ڈائرکٹر مقرر کرنا منظور کیا۔ اور بہت سے کارخانوں کو بالخصوص شکر کے کارخانوں کو عطیہ یا قرضے کے طور پر امداد دی گئی ۱۸۹۸ء میں مدراس گورنمنٹ نے تجربہ کے طور پر ایلومینیم کے برتنوں کا کارخانہ بنایا۔ اور چھ سال کے عرصے میں اچھی کامیابی حاصل کر لی۔ ۱۹۰۳ء میں یہ کارخانہ انڈین ایلومینیم کمپنی کے پاس فروخت کر دیا گیا۔ لارڈ مارلے نے ۱۹۱۰ء میں ایک خط لکھا۔ کہ گورنمنٹ کا روپیہ تجارتی کارخانے قائم کرنے پر خرچ نہ کیا جائے۔ بلکہ صرف یورپین طریق صنعت کی تعلیم تک گورنمنٹ کی کوششیں محدود رہیں۔ ۱۹۱۲ء میں لارڈ کرو نے لکھا۔ کہ صنعتی تعلیم میں یہ بھی شامل ہے۔ کہ ضروری کارخانے بھی قائم کئے جائیں۔ تاکہ اس تعلیم کا عملی حصہ بھی طالبعلموں پر واضح ہو جائے۔ ۱۹۱۴ء میں لارڈ کرو نے تمام صوبجات کے لئے صنعت و حرفت کا محکمہ الگ قائم کرنے کی منظوری دیدی۔ اور ہر صوبے میں ایک ڈائرکٹر صنعت و حرفت مقرر کیا گیا۔ مگر اس منظوری کے بعد بھی گورنمنٹ ہند کو شبہ تھا۔ کہ وہ کس طرح صنعت و حرفت کے کارخانوں کو امداد دیتے ہیں۔ اور تعلیم کے لئے کارخانے قائم کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ گورنمنٹ کی توجہ اس مسئلہ کا پورے طور پر امتحان کرنے کی طرف اس وقت ہوئی۔ جب لڑائی کو کچھ مدت گذر چکی تھی"۔ [53] اس غرض کے لئے گورنمنٹ نے ۱۹۱۶ء میں کمیشن مقرر کی۔ اس کمیشن نے یہ تجاویز پیش کیں۔ ایک یہ کہ علمی تحقیقات کا الگ محکمہ قائم کیا جائے۔ جس کا فرض ہندوستان کے صنعتی مسائل کو حل کرنا ہو۔ کارخانہ دار بھی اپنی مشکلات میں اس

---

[52] ایضاً ص ۷، [53] انڈین انڈسٹریل کمیشن رپورٹ ۱۹۱۸ء صفحہ

محکمہ کے ماہرین سے امداد لے سکیں۔ دو کالج بڑے پیمانے پر بنائے جائیں۔ ایک اعلیٰ درجہ کی صنعتی تعلیم دے۔ اور دوسرا کان کنی اور معدنیات کی تعلیم دے۔ ان کے علاوہ چھوٹے درجے کے کالج انہیں اغراض کے لئے بنائے جائیں۔ گورنمنٹ کی فوجی اور دیگر ضروریات کا سامان بجائے انگلستان کے جیسا کہ اب تک ہوتا رہا ہے۔ حتی الامکان ہندوستان سے خریدا جائے۔ گورنمنٹ موجودہ کارخانوں کو ماہرین مہیا کرکے دے۔ تاکہ ان کے طریق صنعت کی اطلاع ہو۔ گورنمنٹ چھوٹی صنعتی اور زراعتی سوسائٹیوں کو مشینیں بہم پہنچانے کیلئے روپے سے امداد کرے۔ ایک صنعت و حرفت کا محکمہ گورنمنٹ ہند میں قائم کیا جائے۔

یہ محکمے قائم ہو گئے ہیں۔ وزیر صنعت مقرر ہو گئے ہیں۔ وائسرائے کی کونسل کا ایک ممبر ممبر صنعت و حرفت کہلاتا ہے۔ اب عملی کام کی انتظار ہے"!

گورنمنٹ کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانے کی اصل وجہ لڑائی کی مشکلات ہیں۔ جو پچھلے پانچ چھ برس میں پیش آئیں۔ جب یورپ کی جنگ شروع ہوئی۔ تو انگلستان اور فرانس کو امریکہ سے سامان حرب اور تمام اطراف عالم اور سپاہی لیجانے کے لئے بے تعداد جہازوں کی ضرورت تھی۔ ادھر سے جرمن آبدوز کشتیاں نہ صرف جہازوں کی آمد و رفت روک رہی تھیں۔ بلکہ ان کی تعداد کو بھی کم کر رہی تھیں۔ جہازوں کی کمی کے علاوہ انگلستان فرانس اور امریکہ کے تمام کارخانے یورپ کی جنگ کے لئے سامان تیار کرنے میں مصروف تھے۔ ہندوستان کے لئے سامان جنگ اور جنگ کے لوازمات تیار کرنے کے لئے نہ کارخانے فارغ تھے اور نہ جہاز دستیاب ہو سکتے تھے۔ ادھر ہندوستان کو بھی سرحدی جنگ کے لئے اور زیادہ تر عراق عرب کے لئے سامان کی ضرورت

پیش آئی ۔ تب گورنمنٹ ہند کو محسوس ہوا ۔ اور ایسا محسوس ہوا ۔ کہ اس سے پہلے کبھی ایسا احساس نہ ہوا تھا ۔ کہ کم از کم سامان حرب اور لوازمات حرب تیار کرنے کا انتظام ہندوستان میں اتنا ہونا چاہیئے ۔ کہ ایسی مشکل کے وقت میں جب باہر سے سامان نہ آسکے ۔ ملک کی ضروریات ملک کے کارخانوں سے پوری ہو سکیں

اوپر جو ذکر ہوا ہے ۔ کہ انگلستان کے صناعون نے مطالبہ کیا ۔ کہ کمپنی صرف خام اشیاء ہندوستان سے لیجانے کی طرف توجہ کرے ۔ یہ کچھ تشریح طلب ہے ۔ ۱۷ مارچ ۱۷۶۹ء میں کمپنی نے گورنمنٹ ہند کو ایک مراسلے میں لکھا ۔ کہ بنگال میں ریشم کے دھاگے کی پیداوار کو ترقی دی جائے ۔ اور ریشم کے کپڑے کی ساخت کو کم کیا جائے ۔ ۱۷۸۳ء کی کمیٹی کی رپورٹ میں جو ہوس آف کامنز میں ہندوستان کی حکومت کے عدل و انصاف کی جانچ پڑتال کے لئے مقرر ہوئی تھی ۔ اس مراسلے کے متعلق یہ الفاظ لکھے ہیں "اس مراسلے میں مکمل تدبیر جبر اور ترغیب کی ہے ۔ جس کا اثر بڑی حد تک بنگال کی صنعتوں کیلئے مہلک ہوگا ۔ اس کا اثر یہ ہوگا ۔ کہ اس صنعتی ملک کا تمام نقشہ بدلجائیگا اور یہ برطانیہ کی مصنوعات کے لئے خام پیداوار مہیا کرنے کے لئے ایک کھیت کا کام دے گا "۵۴ برطانیہ کی یہ پالیسی کہ مقبوضات اور نوآبادیاں انگلستان کے کارخانوں کے لئے خام اشیاء مہیا کریں ۔ اور ان میں صنعت ترقی نہ کرے ۔ ایک عام پالیسی تھی ۔ نوآبادیوں کو اجازت نہیں تھی ۔ کہ وہ سوائے انگلستان کے کسی اور ملک کے ساتھ تجارت کریں ۔ بہت سے ایسے قوانین بنائے گئے تھے ۔ جن کی رو سے انہیں بعض چیزیں بنانے سے

---

۵۴ ایکونامک ہسٹری آف انڈیا مصنفہ دت ص ۴۵

منع کیا گیا تھا۔ اور یہ بھی ممنوع تھا۔ کہ ان کو اپنے جہازوں میں لاد کرلے جائیں۔ کیونکہ وہ چیزیں انگلستان میں بنتی تھیں۔ اور انگریزی جہازوں میں لائی جاتی تھیں"۔ ۵۵ انگلستان چاہتا تھا۔ کہ وہ تمام اشیاء جن کے بغیر کوئی ملک تہذیب کی صف اول میں کھڑا نہیں ہو سکتا۔ انگلستان کے سوا اور کسی جگہ نہ بنیں ۵۶ جب ریاستہائے متحدہ امریکہ انگریزوں کے قبضے میں تھیں۔ تو انگلستان کے وزراء نے منع کر دیا تھا۔ کہ امریکہ میں وہ اشیاء نہ بنیں۔ جو انگلستان سے بنا کر بھیجی جاتی ہیں"۔ ۵۷ انگلستان کے ماہران علم اقتصاد یہ خیال کرتے تھے۔ کہ امریکہ قدرتی طور سے صنعتی ترقی کے لائق نہیں ۵۸ انگلستان کی خود غرضی سے آئرلینڈ کو اتنا نقصان پہنچا۔ کہ ان لوگوں میں صنعت کا مادہ ہی نہ رہا۔ ۵۹ انیسویں صدی میں بھی انگلستان نے یہ طریق جاری رکھا۔ کہ مشینوں اور کاریگروں کا ملک سے باہر جانا بند کر دیا۔ یورپ کے دیگر ممالک چوری سے مشینیں نکال لائے۔ اور کاریگروں کو لا کر ان کی مدد سے نقل کر لی۔ امریکہ نے بھی ایسا ہی کیا۔ مگر اس کے علاوہ انہوں نے انہی کاموں کے لئے انگریزی مشینوں کا مطالعہ کر کے نئی مشینیں بنا لیں۔ تو کئی حالتوں میں انگریزی مشینوں سے اچھی ہوتی تھیں غرض یہ ایک عام دستور تھا۔ کہ پرانی قومیں چاہتی تھیں۔ کہ کوئی نئی قوم صنعت میں ان کی ہمسری نہ کرے۔ اور اس لئے نئی قوموں کو جہالت میں رکھنے کی پوری کوشش کی جاتی تھی۔

اگر ہندوستان میں اپنی حکومت ہوتی۔ اور حکمران بیدار مغز ہوتے۔ تو سب سے پہلے انہیں چند باتوں کی فکر ہوتی۔ وہ یہ کہ ملک

---

۵۵ ٹریڈ اینڈ انڈسٹری مصنفہ مارشل ص ۱۶، ۱۷ ۵۶ ایضاً ص ۱۷،
۵۷ ایضاً ص ۵۷، ۵۸ ایضاً ص ۵۸، ۵۹ ایضاً ص ۱۷۔

کی ریلیں خود بنا سکیں۔ ریلوں کے انجن اور تمام مشینیں پہیے وغیرہ آہنی سامان خود تیار کر سکیں۔ برقی تار خود تیار کر سکیں۔ جہاز اپنے ملک میں بنا سکیں۔ توپ، بندوق اور تمام فوجی سامان خود ملک کے اندر بنا سکیں۔ موٹر کار اور ضروری ربڑ کی چیزیں خود تیار کر سکیں۔ اور ضروری بوٹ اور کپڑا فوج کے لئے ملک میں بنا سکیں۔ کیونکہ ان چیزوں کے بغیر ملک کی حفاظت ممکن نہیں۔ اگر یہ چیزیں غیر ممالک میں بنوائی جائیں۔ تو وہی حال ہوگا۔ جو لڑائی کے شروع میں ٹرکی کا ہوا۔ جو جنگی جہاز ٹرکی کے لئے انگلستان میں بن رہے تھے۔ لڑائی شروع ہوتے ہی انگلستان نے اپنے استعمال میں لے لئے۔ اگر گورنمنٹ ملکی ان تمام چیزوں کے لئے زر کثیر صرف کر کے کارخانے بناتی۔ تو وہ کاریگر جو ان کارخانوں میں سیکھ کر نکلتے۔ ملک میں نئے نئے کارخانے بناتے۔ اور صنعت عام ترقی کر جاتی۔ ہندوستان کو انگلستان کے ساتھ تعلق ہونے سے یہ نقصان ہوا ہے۔ کہ گورنمنٹ ہند کا تمام سہارا انگلستان پر ہے۔ اس لئے ہندوستان اپنے آپ کو ان اشیاء کے بنانے سے مستغنی سمجھتا ہے۔ اور اس خیال پر جما ہوا ہے۔ کہ جن اشیاء کی ضرورت ہوگی۔ انگلستان سے مل جائیں گی۔ ریل کا سامان بنانا تو درکنار۔ ریل کی مرمت کے کارخانے جو ملک میں ہیں۔ ان سے بھی ملک کو پورا فائدہ نہیں پہنچ سکا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اعلیٰ درجہ کے کام سب یورپین لوگوں کے سپرد ہیں۔ اگر حکومت ملکی ہوتی۔ تو اپنی ضرورت کے لئے یہ تمام کام ملکی لوگوں کے سپرد کرتی۔ اس بات سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ملکی حکومت کا ہونا خواہ مخواہ اس بات کا مستلزم ہے۔ کہ صنعت میں ترقی ہو۔ ہمارے سامنے ایران افغانستان اور ٹرکی کی مثالیں موجود ہیں۔ جنہوں نے باوجود ملکی حکومت ہونے کے اپنی حفاظت کا سامان ملک میں بنانے کی فکر نہیں کی۔ ملکی حکومت کے ساتھ باہمت اور

بیدار مغز ہونا بھی لازم ہے۔
سنہ ۱۸۶۰ء اور سنہ ۱۸۷۰ء کے درمیان جرمنی کے تمام دخانی جہاز انگلستان میں بنتے تھے۔ قدرتی طور پر جرمنی ایسی جگہ واقعہ ہوا ہے۔ کہ جہاز بنانے میں انگلستان کا مقابلہ ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ لوگ اس کام پر روپیہ خرچ کرنے سے جھجکتے تھے۔ اگر گورنمنٹ رہنمائی نہ کرتی۔ تو جرمنی کی طاقت خشکی تک محدود رہتی۔ سنہ ۱۸۷۲ء میں جرمن گورنمنٹ نے یہ اصول قائم کیا۔ کہ خواہ خرچ کتنا ہی ہو۔ تمام جنگی جہاز جرمن کارخانوں میں بنیں۔ جرمن جہازی کارخانوں کو بغیر محصول کے تمام مصنوعہ اور خام اشیاء لانے کی اجازت دیدی گئی۔ اس کے علاوہ جرمن گورنمنٹ جہازی کمپنیوں کو سالانہ مقررشدہ امداد دیتی رہی۔ ان کارروائیوں کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ نہ صرف جرمنی نے ایسا بحری بیڑا تیار کرلیا۔ جو تمام دنیا کے بیڑوں میں تعداد میں دوسرے درجہ پر تھا۔ اور خوبی میں کسی سے کم نہیں تھا۔ بلکہ تجارتی جہازوں کا ایسا بیڑا تیار کیا۔ جس کے مقابلے کے جہاز کسی قوم کے پاس نہیں تھے۔ ذیل کے اعداد سے معلوم ہوگا۔ کہ جہاز سازی نے جرمنی میں کس طرح ترقی کی۔

لوہے اور فولاد کے جہاز جو جرمنی میں بنے۔ [۵۷]

سنہ	وزن	
۱۸۸۰	۲۳۹۸۶	ٹن
۱۸۸۵	۲۴۵۵۴	"
۱۸۹۰	۱۰۰۵۹۷	"
۱۸۹۵	۱۲۲۷۱۲	"
۱۹۰۰	۳۵۵۱۷۱	"
۱۹۰۹	۳۲۶۳۱۸	"

[۵۷] ماڈرن جرمنی مصنفہ جے ای بارکر صفحہ ۶۱۴۔

جرمن تجارتی جہازوں کی تعداد میں جو ترقی ہوئی وہ ذیل کے اعداد سے ظاہر ہے:[۵۸]

سنہ		
۱۸۷۱	۸۱۹۹۴	ٹن
۱۹۱۰	۲۳۴۹۵۵۷	"

اس ترقی کا باعث صرف گورنمنٹ کی امداد ہی نہیں تھی۔ بلکہ جیسا کہ تمام ممالک کا تجربہ ہے۔ افراد غیر ملکی طاقتور اور تجربہ کار کارخانوں کا مقابلہ بغیر گورنمنٹ کی امداد کے نہیں کر سکتے۔ اور گورنمنٹ کی امداد ضائع جاتی ہے۔ اگر افراد پورے زور سے کوشش نہ کریں جرمنی کی حیرت انگیز جہاز سازی کی ترقی کے بواعث کچھ تو انتظامی خوبی تھی۔ کچھ صنعت میں سائنس کے اصولوں کا استعمال اور کچھ ولکن اور دوسرے کارخانوں کی ہمت اور ثابت قدمی۔ جرمن یاربک (gahrbuch) میں وزیر بحری نے جہاز سازی کے متعلق ذیل کے الفاظ لکھے ہیں۔ جو قابل غور ہیں "ہمارے جہاز سازوں کا ارادہ تمام قوموں کے ساتھ مقابلہ کرنے کا ہے۔ مگر یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے۔ جب ہمارے جہاز ساز سستا مال بنا سکیں۔ اگر جرمنی اپنی جہازی صنعت کو سرکاری امداد سے ترقی دینے کی کوشش کرے۔ تو تمام ممالک اسی طرح کرنے لگیں گے۔ ایک تباہی خیز مقابلہ شروع ہو جائیگا۔ اور آخرکار باہمی سمجھوتے سے تمام امداد کو بند کرنا پڑے گا۔ جیسے کہ کھانڈ کے معاملے میں ہوا۔ جہاز بنانے کے کام میں انگلستان کو بہت سے قدرتی فوائد حاصل ہیں۔ جو جرمنی کو نہیں۔ خصوصاً جہازی کارخانوں کا کوئلے اور لوہے کی کانوں کے قریب ہونا بڑا فائدہ ہے۔ مگر ہم حسن انتظام اعلیٰ صنعتی تعلیم اور جہاز سازوں اور جہاز رانوں کی باہمی امداد سے ان نقصانات کا ازالہ کر دیتے ہیں۔"[۵۹]

---

[۵۸] ایضاً ص ۶۲۱ [۵۹] ایضاً ص ۶۱۵

جہازسازی کے علاوہ ہر ایک قسم کی صنعت کو ترقی دینے کے لئے جرمن گورنمنٹ ہر وقت کوشاں رہتی تھی۔ کارخانوں کو روپے سے امداد دینا کاریگروں کا غیر ممالک سے لاکر اپنے ملک میں آباد کرنا۔ غیر ممالک سے مشینیں منگوا کر ان کا امتحان کرواکے ان کی نقل کروانا بنیک بنانے میں امداد کرنا معمولی طریقے ہیں۔ جن سے جرمنی نے اپنے ملک کی صنعتوں کو ترقی دی ہے۔ انگلستان سے مشینوں کا باہر لیجانا منع تھا مگر باوجود ممانعت کے ہر نئی مشینیں گورنمنٹ جرمنی کے خرچ پر خرید کر برلین کے گیور بے انسٹیٹیوٹ میں بھیجی جاتی تھی۔ وہاں اس کا امتحان کیا جاتا تھا۔ اور اگر کامیاب ہوتی تھی تو اس کا نمونہ بنا کر عجائب گھر میں رکھ دیا جاتا تھا۔ اور مشین کسی ہوشیار کارخانہ دار کو دے دی جاتی تھی۔

دوسری مثال جاپان کی ہے۔ جاپان نے ۱۸۵۶ء میں غیر سلطنتوں کے ساتھ معاہدے کرکے اپنے ملک کی تجارت کو کھولا۔ اور اسی وقت سے ملک کی توجہ ترقی کی طرف ہوئی۔ ۱۸۶۲ء میں فوج کو یورپین طریق پر مرتب کیا۔ بحری بیڑے کی طرف ۱۸۵۵ء میں توجہ ہوئی۔ ناگاساکی میں ڈچ افسروں کے ماتحت بحری لڑائی کا کام سکھانا شروع کیا۔ ۱۸۵۷ء میں ڈچ گورنمنٹ سے جنگی جہاز خریدے۔ بعد میں اپنے ملک میں جہاز بنانے کی کوشش کی۔ پہلے پہل یورپین اور امریکن کاریگروں کے ماتحت کام شروع کیا۔ اور آہستہ آہستہ اپنے آدمیوں کو سکھاتے گئے۔ ادھر تجارتی جہازوں کی کمپنیاں بنائیں۔ ان سب کوششوں کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ اس وقت جاپان بحری طاقت میں انگلستان اور امریکہ کے سوائے اور کسی سے کم نہیں۔ پچاس لاکھ* ین (جاپانی سکہ) سالانہ گورنمنٹ کے خزانے سے تجارتی جہازوں کی کمپنیوں کی امداد

---

*۱۰ ین = ایک پونڈ۔

پر خرچ ہوتا رہا ہے۔ اور چھ کروڑ ین سالانہ جہازوں کے کارخانوں پر[10]
اس ترقی کا صحیح اندازہ ذیل کے اعداد سے ہو گا۔

۱۸۷۶ء میں جاپان میں دخانی جہازوں کا وزن ۱۷۹۵۲ (سترہ ہزار) تھا۔ اور ۱۹۰۸ء میں ۱۴۸۳۸۹۵ (چودہ لاکھ)۔ ۱۸۸۶ء میں آہنی جہازوں کی تعداد صرف ۷۶ تھی۔ اور ۱۹۰۸ء میں ۴۰۹ (چار سو)[11] جہازوں کے کارخانوں کو گورنمنٹ اتنی امداد دیتی تھی۔ کہ وہ اس قیمت پر جہاز بنا کر بیچ سکیں۔ جس پر یورپ سے بن کر آتے ہیں۔ گویا جاپان اور یورپ کے کارخانوں کی قیمت میں جو فرق تھا۔ اس کو گورنمنٹ ادا کر دیتی تھی۔ ۱۹۰۲ء میں ہر قسم کی بڑی سے بڑی توپیں جاپان میں بننے لگیں۔

۱۸۶۹ء میں ایک قحط پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں چاول لیجانے کا انتظام نہیں ہو سکتا تھا۔ انگلستان سے قرضہ لے کر انگریزی انجینیروں کی امداد سے ۱۸۷۲ء میں پہلی ریل بنائی۔ مگر ۱۸۷۸ء کے بعد تمام ریلیں جاپانی انجینیروں نے بغیر بیرونی امداد کے بنائیں۔

صرف جنگی ضروریات کے لئے ان ممالک کی گورنمنٹوں نے نئے کارخانے چلانے اور ریلوں کو امداد دینے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ انہوں نے ہر قسم کی صنعتی ترقی کو ملک کی تقویت کا باعث سمجھا۔ جرمنی کے متعلق ایک انگریز مصنف کی تحریر بطور شہادت پیش کی جاتی ہے
"تجارت اور صنعت دونوں کو ہر ریاست سے عملی امداد ملتی ہے۔ اور مرکزی حکومت سے بھی۔ یہ خیال کہ جرمن سفیر بطور ایک تجارتی ایجنٹ کے کام کرتا ہے۔ غلط ہے۔ مگر یہ درست ہے۔ کہ جرمن سفیر

---

[10] ماڈرن جاپان کے پچاس سال مرتبہ کونٹ اوکوما صفحہ ۵۴۴۔
[11] ایضاً صفحہ ۵۴۶۔

ہمیشہ اس فکر میں رہتے ہیں ۔ کہ جب موقعہ ملے ۔ اپنے ملک کی صنعت کو فائدہ پہنچائیں ۔ حفاظتی محصول کے علاوہ چونکہ ریلیں گورنمنٹ کے انتظام کے ماتحت ہیں ۔ اپنے ملک کے صناعوں کی امداد کے لئے تاکہ وہ غیر ملکوں میں اپنا مال متقابلے پر بیچ سکیں ۔ خصوصیت سے تھوڑا کرایہ لگایا جاتا ہے ۔ گورنمنٹ نے کروڑوں پونڈ نہروں پر خرچ کر دئے ہیں ۔ تاکہ ملک کے کارخانوں کا مال تھوڑے کرایہ جہازوں میں لاکر جا سکے ۔ خود شاہنشاہ جرمنی تمام قسم کے کارخانوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے ۔ تمام جرمنی میں کوئی صنعت نہیں ۔ جس کی حالت سے وہ ذاتی طور سے واقف نہ ہو ۔ اور یہ واقفیت بار بار کارخانوں کا ملاحظہ کرکے پیدا کی گئی ہے ۔ جب کوئی نیا جہاز ملک میں بنتا ہے ۔ تو پہلے دعوتی کھانے پر شاہنشاہ کی طرف سے مبارکباد کا تار پہنچتا ہے " ؎۱۲

۱۸۷۲ء میں جاپان میں قومی بنک بنانے کی ضرورت پڑی ۔ کوئی شخص اس کام کے لئے تیار نہیں تھا ۔ آخر گورنمنٹ نے دو ساہوکاروں مٹسیکومی اور آنوکومی کو مجبور کرکے آمادہ کیا ۔ ابتدا میں بنک کا سرمایہ پچیس لاکھ ین تھا ۔ اس میں سے بیس لاکھ ین ان ساہوکاروں کا تھا ۔ اور باقی ۸۰ آدمیوں کی طرف سے تھا ۔ اس سے صاف ظاہر ہے ۔ کہ اس وقت لوگ کمپنی بنانے اور اس قسم کے کاروبار کیطرف راغب نہ تھے ۔ سنہ ۱۸۸۰ء تک بھی گورنمنٹ خود مشینیں خرید کر نمونے کے طور پر کارخانے بناتی رہی ۔ تاکہ لوگوں کا اس طرف میلان ہو ۔ ۱۸۷۳ء میں گورنمنٹ کے ستر عہدہ دار وینا (آسٹریلیا) کی نمائش دیکھنے کیلئے بھیجے گئے ۔ ان کا مشیر ایک جرمن ڈاکٹر ویگنر تھا ۔ اور ان ساتھ کاریگروں کی ایک بڑی جماعت تھی ۔ نمائش سے تمام

؎۱۲ دی ایویلوشن آف ماڈرن جرمنی مصنفہ ڈاسن ص ۹۰

قسم کی صنعتوں کے لئے نئے آلات اور مشینیں خرید کر لائے۔ اس کے بعد امریکہ کی نمائش سے ہر قسم کے نئے آلات اور مشینیں خرید کر لائی گئیں۔ اور ان کو جاپان میں رواج دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی گورنمنٹ نے صنعتی مدارس قائم کئے۔ جن میں نئے طریق کی صنعت سکھائی جاتی ہے۔ ۱۹۰۶ء میں جاپان میں ۵۲۸۴ (پانچ ہزار) صنعتی سکول تھے۔ اور ۲۵۰۰۹۰ (دو لاکھ پچاس ہزار) طالب علم تھے۔ ابتدا میں گورنمنٹ کا قاعدہ تھا۔ کہ جس قدر نئی باتیں یورپ اور امریکہ سے مل سکیں۔ ان سب کو ایک دفعہ جاری کر دیا جاتا تھا۔ غیر ممالک سے تخم اور پودے اور کاشتکاری کے آلات بڑی مقداریں میں لاکر امتحان کیا گیا۔ مگر اس وقت زراعت کی حالت ایسی نہ تھی۔ کہ گورنمنٹ کی کوشش سے فائدہ ہو سکتا۔ اب ٹوکیو میں ایک زراعتی کالج ہے۔ دو ہائی سکول ہیں۔ اور ایک سو کے قریب ادنی درجہ کے سکول ہیں۔ لاکھوں کاشتکار ان مدرسوں میں تعلیم پاکر اور زراعت کے علمی طریق سیکھ کر ملک میں کام کر رہے ہیں۔ ہر سال سرکاری عہدہ دار یورپ اور امریکہ بھیجے جاتے ہیں۔ تاکہ وہاں سے اعلیٰ قسم کے مویشی خرید کر لائیں۔ جن سے ملک کے مویشیوں کی نسل میں ترقی ہو۔

۱۸۹۴ء اور ۱۹۰۳ء کے درمیان یہ حالت پیدا ہو گئی۔ کہ جو کارخانہ دار پہلے بالکل گورنمنٹ کی رہنمائی اور گورنمنٹ کے سہارے سے کام کرنے کے عادی تھے۔ بغیر گورنمنٹ کی امداد کے ہر قسم کے کاموں میں جرأت سے داخل ہونے لگے۔ اس کے بعد اور بھی ترقی شروع ہوئی۔ ۱۸۹۵ء میں ۲۴۵۸ (دو ہزار) کمپنیاں اور ۲۵۸۷۴۰۴۷ این سرمایہ تھا۔ ۱۹۰۶ء میں ۹۳۲۹ (نو ہزار) کمپنیاں اور ۱۰۶۹۷۰۶۰۸۳۳ این سرمایہ ہو گیا۔

ان ملکوں کی کوشش یہ تھی۔ کہ تمام جنگی سامان ملک کے

اندر بنایا جائے۔ اور جنگی سامان کے علاوہ تمام ضروری اشیاء بھی ملک کے اندر ہی بنیں۔ مگر گورنمنٹ ہند اب تک اپنی ضرورت کی وہ اشیاء بھی جو ملک میں بن سکتی ہیں۔ باہر سے خریدتی رہی ہے[۱۳]

سوال یہ ہے۔ کہ آئندہ کیا ہوگا۔ کیا گورنمنٹ ہند اسی طریق پر عمل کرے گی۔ جس پر جاپان اور جرمنی نے کیا۔ اور آئندہ تیس سال میں ملک کی حالت بدل جائے گی۔ قیاس یہ چاہتا ہے۔ کہ گورنمنٹ ہند ایسا نہیں کر سکے گی۔ جب تک اہل ملک خود پوری کوشش نہ کریں گے۔ محض گورنمنٹ کی کوششوں سے بہت فائدہ نہیں ہوگا۔ گورنمنٹ ہند ایسی کوشش نہیں کر سکتی جیسی جاپان یا جرمنی نے کی۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ جاپان اور جرمنی کے لئے یہ موت اور زندگی کا سوال تھا۔ اگر وہ اپنی صنعتوں کو ترقی نہ دیتے۔ تو ان کی آزادی اور عزت خطرے میں تھی۔ وہ دوسرے ملکوں کا مقابلہ نہ کر سکتے۔ ہندوستان کی حالت یہ نہیں ہے۔ ہندوستان کا سہارا انگلستان پر ہے۔ گورنمنٹ ہند اور اس کے عہدہ داروں میں وہ حالت اضطرار پیدا نہیں ہو سکتی۔ جو جاپان اور جرمنی میں تھی۔ اور بغیر ایسی مضطربانہ کوشش کے کسی ملک کا تھوڑے سے عرصے میں اتنی ترقی کرنا ناممکن ہے۔

گورنمنٹ سے بھی بڑھ کر ذمہ واری اہل ملک کی ہے ہندوستان میں بہت سے طبقات ہیں۔ اس لئے ہم یکے بعد دیگرے ہر طبقے کا الگ ذکر کریں گے۔ سب سے پہلے راجاؤں۔ نوابوں اور جاگیرداروں کا طبقہ ہے۔ ایسے رئیسوں کی تعداد جن کی آمدنی ایک لاکھ روپے سے زیادہ ہو ہزاروں ہو گی۔ ان لوگوں کے لئے ملکی صنعتوں کو ترقی دینا نہایت آسان تھا۔ قدیم زمانے میں انہی لوگوں کی وجہ سے اہل ہنر ملک میں بستے تھے۔ مگر اب انگریزی اشیاء کے آنے سے ان کے مذاق بھی بدل گئے

---

[۱۳] انڈین انڈسٹریل کمیشن رپورٹ ۱۹۱۸ء ص ۱۴۸۔

ہیں۔ اور ان کی توجہ ان پرانے ہنروں کی طرف نہیں رہی۔ اگر یہ انگریزی اشیاء کو استعمال نہ کرتے۔ اور پرانے کاریگروں کے کام جاری رکھتے۔ تو بھی اگرچہ اہل ہنر بھوکے نہ مرتے۔ ملک کے لئے اچھا نہ ہوتا۔ ناقص ہنر کا مصنوعی ذرائعہ سے قائم رکھنا ایسا ہی ہے۔ جیسا پرانے بوسیدہ مکان کا ستون کھڑا کر کے گرنے سے بچانا۔ مگر انہوں نے یہ بھی نہ کیا۔ اور اپنی عیش و عشرت کا مرکز ہندوستان سے اٹھا کر یورپ میں رکھ دیا۔

نوابوں اور رئیسوں کے پاس ملک کی صنعت کو ترقی دینے کے لئے اس قدر روپیہ ہے۔ کہ اگر یہ تمام کے تمام مشینیں منگوا کر مختلف کاموں کے کارخانے جاری کر دیں۔ اور نفع نقصان کا ابتدا میں خیال نہ کریں۔ تو چند سالوں میں یہ خود بھی مالا مال ہو جائیں گے۔ اور ملک بھی آسودہ ہو جائیگا۔ ان میں سے اکثر یورپ کی سیر کے لئے جاتے ہیں۔ اور عیش و عشرت پر لاکھوں روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ ان کے محلات کو اگر دیکھا جائے۔ تو یورپ کی صنعت کے عجائب گھر ہیں۔ اگر ان کی توجہ اس طرف ہو۔ تو ایسی مشینوں کی تلاش میں رہیں۔ جو آسانی سے ملک میں رواج پا سکتی ہیں۔ ایسے ہنرمندوں کو تلاش کر کے لائیں۔ جو ایک سال دو سال میں کوئی آسان سگر سفید ہنر اہل ملک کو سکھا کر چلے جائیں۔ مگر ہم اگر رئیس یا راجہ کی نسبت سنتے ہیں کہ وہ یورپ سے کسی آدمی کو ساتھ لایا ہے۔ تو یا تو وہ کوئی حسین عورت ہوتی ہے۔ اور یا کوئی یہ کرکٹ کھیلنے کا ماہر جو راجہ اور اس کے کھلاریوں کو چھ مہینے رہ کر کرکٹ کھیلنا سکھا جاتا ہے۔

ہندوستان کے راجاؤں اور نوابوں کی عجب حالت ہے بیرونی حملے کا ان کو اس لئے ڈر نہیں۔ کہ گورنمنٹ ہند نے ان کی حفاظت کا ذمہ اٹھا رکھا ہے۔ اس لئے انہیں حفاظت کے

لیے سامان بنانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اندرونی فساد کے رفع کرنے کیلیے بھی انگریزی افواج موجود ہیں۔ اس لیے ان کی زندگی بالکل امن میں گذرتی ہے۔ اگر ان کو اندرونی یا بیرونی خطرات ہوتے۔ تو وہ صنعتی ترقی سے اس قدر غافل نہ ہوتے بعض راجاؤں نے جب ادھر توجہ کی۔ تو اس طرز پر کی۔ کہ کارخانے جاری کرکے انگریز ماہرین کے سپرد کر دئیے۔ اور یہ فکر نہیں کی۔ کہ حقیقی فائدہ ملک کو اس وقت ہوگا۔ جب اہل ملک تمام کام خود کر سکیں گے۔ ایک دو ریاستوں نے البتہ صحیح طریق سے کوشش کی ہے۔ اگر باقی ریاستیں بھی ان کی تقلید کریں۔ تو ملک کے لئے بہت بہتر ہوگا۔ سب سے مشکل مرحلہ وہ ہے۔ جب ایک کام بغیر پہلے تجربے کے ملک میں جاری کیا جائے۔ ایسی ناتجربہ کاری کی حالت میں اکثر نقصان کا ڈر ہوتا ہے۔ اور ایسے نقصان وہی لوگ برداشت کر سکتے ہیں۔ جن کے پاس بافراط مال ہو۔ جیسے کے ہندوستان کے رئیس و نواب ہیں۔ جب کارخانے کو کامیابی حاصل ہو جائے۔ تو پھر تھوڑے سرمایہ کے ساتھ بھی اس کی تقلید میں کام جاری کئے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ نقصان کا خدشہ کم ہو جاتا ہے۔ پس سب سے پہلے ہندوستان کے راجاؤں اور نوابوں اور ان سے کم درجہ کے رئیسوں کا فرض تھا۔ کہ صنعت اور زراعت کے تمام نئے آلات کا خود تجربہ کرتے۔ اور کم درجے کے لوگ ان کی تقلید کرتے۔ خاص کر زمینداری میں تو ان ہی لوگوں کا فرض تھا۔ کہ تمام نئے آلات کا تجربہ کرتے۔ اور علمی طریق پر اپنی زمینوں کی کاشت کرواتے۔ مویشیوں کی عمدہ نسلیں غیر ممالک سے لاکر اپنے ملک میں رواج دیتے۔ باغات اور میوہ جات کی پیداوار کی کوشش کرتے۔ اور میوہ جات کو محفوظ طور پر بند کرکے ممالک میں بھیجتے۔ وہ سیب یا ناشپاتی جو کشمیر میں ایک یا دو پیسے کو مل سکتی ہے۔ وہی جب

ایسے طریق سے ٹین میں بند ہوکر غیر ملک سے آتی ہے۔ کہ خراب نہ ہو سکے۔ تو اسی کو لوگ ڈیڑھ یا دو روپے پر شوق سے خرید لیتے ہیں۔ ایک معمولی سا فن ہے۔ مگر اس ملک میں کسی کو نہیں آتا۔ اس لئے یہاں کا میوہ موسم میں سستا بک جاتا ہے۔ اور جب موسم گذر جاتا ہے۔ تو وہی ٹین میں بند ہو کر غیر ملک سے آ کر بے حد مہنگا بکتا ہے گورنمنٹ کے اگریکلچرل فارم ایسا کام نہیں کر سکتے۔ جیسا معزز زمینداروں کا نمونہ۔ گورنمنٹ کے فارموں کے متعلق کاشتکاروں کو یہ شبہ رہتا ہے۔ کہ یہ طریق تجارتی اصول پر نفع مند نہیں ہیں لیکن اگر بڑے بڑے زمیندار تجارتی اصول پر نئے آلات اور نئے طریقوں کو سفید ثابت کریں۔ تو چھوٹی حیثیت کے زمیندار ضرور ان کی تقلید کریں گے۔ ان کی بڑھتی ہوئی دولت چھوٹے زمینداروں کے لئے کافی کشش کا موجب ہو گی۔ برخلاف اس کے اگر گورنمنٹ کے فارم تجارتی اصول پر بھی کام کریں۔ تو ان کے نفع و نقصان کا علم عام لوگوں کو نہیں ہو سکتا۔ زمین کی پیداوار میوہ جات کی کاشت مویشیوں کی نسل دودھ اور مکھن۔ مرغی اور انڈے۔ ان سب چیزوں میں علمی طریقوں سے بہت ترقی ہو سکتی ہے۔

ذیل کے نقشے سے واضح ہو جائیگا۔ کہ علمی طریق سے کاشت کرنے سے پیداوار میں کس طرح ترقی ہو سکتی ہے۔

جرمنی میں پیداوار کی فی ہیکٹر (۲½ ایکڑ) ؎ ۱

وزن کلوگرام میں دئے گئے ہیں۔

سنہ	گیہوں	جو	گھاس
۱۸۹۳	۱۶۷۰	۱۴۸۰	۲۲۳۰
۱۸۹۴	۱۶۹۰	۱۷۸۰	۳۸۳۰

؎ ۱ ماڈرن جرمنی مصنفہ بارکر ص ۴۸۸

۱۸۹۵	۱۶۴۰	۱۶۸۰	۳۷۰۰
۱۸۹۶	۱۷۷۰	۱۶۵۰	۳۹۰۰
۱۸۹۷	۱۷۰۰	۱۵۶۰	۴۲۸۰
۱۸۹۸	۱۸۴۰	۱۷۳۰	۴۳۸۰
۱۸۹۹	۱۹۱۰	۱۸۲۰	۴۰۴۰
۱۹۰۰	۱۸۷۰	۱۸۰۰	۳۹۱۰
۱۹۰۱	۱۵۸۰	۱۷۹۰	۳۷۶۰
۱۹۰۲	۲۰۴۰	۱۸۹۰	۴۳۷۰
۱۹۰۳	۱۹۷۰	۱۹۵۰	۴۴۵۰
۱۹۰۵	۱۹۲۰	۱۷۹۰	۴۴۱۰
۱۹۰۷	۱۹۹۰	۲۰۶۰	۴۱۷۰
۱۹۰۹	۲۰۵۰	۲۱۲۰	۳۷۱۰
۱۹۱۰	۱۹۹۰	۱۸۵۰	۴۷۴۰

ایسے ہی مویشیوں کی نسلوں میں بے حد ترقی ہو سکتی ہے۔ ہندوستان کا گھوڑا فرانس کے گھوڑے کے سامنے کھڑا کر دیا جائے۔ اتنا ہی فرق معلوم ہوگا۔ جتنا ہمارے ملک کے اچھے گھوڑے اور گدھے میں ہے۔ دو فرانسیسی گھوڑے اتنا اسباب کھینچ کر لے جا سکتے ہیں۔ جتنا ایک بڑی موٹر لاری میں آسکتا ہے۔ ہمارے ملک میں زیادہ سے زیادہ دودھ دینے والی گائے مہینے میں دو سو پچاس سیر سے زیادہ دودھ نہ دیتی ہوگی۔ مگر انگلستان کی سب سے زیادہ دودھ دینے والی گائے نے ۵۳ دن میں ۳۱۳ گیلن دودھ دیا۔ جو تقریباً ۴۵ سیر روزانہ ہوتا ہے۔ اکثر اوقات ہندوستان میں شکایت کی جاتی ہے۔ کہ دودھ اور گھی مہنگا ہو گیا ہے۔ اور اس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے۔ کہ گائیں ذبح کی جاتی ہیں۔ مگر یہ صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ مسلمان بادشاہوں کے وقت میں بھی ذبح ہوتی تھیں۔ صحیح

سبب یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ملک میں آبادی بڑھ گئی ہے۔ گھی اور دودھ کو استعمال کرنے والے زیادہ ہو گئے ہیں۔ اور گایوں کی تعداد بڑھانے اور زیادہ دودھ دینے والی گایوں کی نسل کو ترقی دینے کی کوشش نہیں کی گئی۔ گھی اور دودھ سستا کرنے کا طریق یہی ہے۔ کہ ملک میں بے شمار جنگل ہیں۔ ان سے کام لیا جائے۔ گائیں اور بھینسیں بڑی تعداد میں رکھی جائیں۔ اور شہروں میں ریل کے ذریعہ سے یا موٹر لاریوں وغیرہ میں لاد کر دودھ بھیجا جائے۔ ورنہ اگر شہروں میں دودھ شہر میں گائے بھینسیں رکھ کر مہیّا کیا جائے۔ تو جیسے شہروں میں مکانوں کے کرایہ اور چارے کی قیمت بڑھتی جائے گی۔ دودھ مہنگا ہوتا جائیگا۔

زمین کی کاشت میں جس قدر ترقی کی ضرورت ہے۔ اس سب کے ذمہ وار بڑے بڑے زمیندار ہیں۔ اور اب تک جو ملک نے اس بات میں ترقی نہیں کی۔ اس کا الزام بھی ان زمینداروں کے سر پر ہے۔ اکثر لوگوں کا قاعدہ ہے۔ کہ ہندوستان کی اقتصادی پستی کا الزام تمام کا تمام انگلستان کے سر پر تھوپتے ہیں۔ مگر انگلستان نے زراعت کی ترقی میں کبھی روک نہیں ڈالی۔ بلکہ انگلستان کا عین منشاء ہے۔ کہ زراعت میں ترقی ہونا۔ کہ انہیں خام اشیاء آسانی سے مل جائیں۔ پس اگر زراعت میں بھی ترقی نہیں ہوئی۔ تو اس سے سوائے اس کے اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ کہ زمینداروں کو ان باتوں کا شوق ہی نہیں۔ وہ علو ہمت اور استقلال جو ان کاموں میں کامیابی کے لئے درکار ہے۔ زمینداروں کے اعلیٰ طبقہ میں نہیں۔

رئیسوں کے بعد ساہوکاروں سے توقع ہو سکتی تھی۔ کہ وہ اپنے روپے کو ان کاموں میں خرچ کریں گے۔ مگر بمبئی کے تاجروں کو چھوڑ کر افد تمام ملک میں چند اور افراد سے قطع نظر کرکے عموماً

ساہوکاروں کی غرض محض روپیہ پیدا کرنا ہے۔ خواہ وہ روپیہ ملک غیر ملک کا مال لاکر بیچنے سے ہو۔ یا اپنا مال غیر ممالک میں بھیجنے سے ملے۔ نئے کام جاری کرنے میں علم اور جرأت کی ضرورت ہے۔ اور نقصان کا احتمال رہتا ہے۔ اس نقصان کو اٹھانے کیلئے وہی شخص تیار ہوسکتا ہے جس کی غرض محض روپیہ پیدا کرنا نہ ہو۔ اگر ایک ساہوکار کو بیس اور پچیس فی صدی سود گھر بیٹھے بٹھائے انگریزی عدالتوں کے ذریعہ سے کاشتکاروں سے مل سکتا ہے۔ تو اُسے کیا ضرورت پڑی ہے۔ کہ وہ انگریزی مشینوں پہ روپیہ خرچ کرے اور اگر کام نہ چلا۔ تو سرمایہ بھی بیٹھے۔ ملک غریب ہوگا۔ کاشتکار غریب ہوں گے۔ آئندہ فصل کے لئے عمدہ کاشت نہیں ہوگی۔ مگر ساہوکار کو اپنے حصے سے زیادہ مل جائیگا۔ وہ پھر بھی مالدار کہلائیگا۔ اور اپنے تمام گردونواح میں وہی مالدار ہوگا۔ اور یہی اس کی آرزو ہے۔ اسے کیا ضرورت پڑی ہے۔ کہ ایک موہوم فائدے کی غرض سے اپنا مال خطرے میں ڈالے۔ یہی ساہوکار اگر کسی اور کا کارخانہ دیکھیں۔ کہ منافع ہو رہا ہے۔ اور کام چل رہا ہے تو یہ بھی کارخانے بنانے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ مگر ابتدا کرنے کے لئے اور ابتدائی نقصانوں کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ان نقصانوں کو وہی شخص اٹھانے کے لئے تیار ہو سکتا ہے۔ جو ان عظیم الشان فوائد کو سمجھتا ہو۔ جو نئے کام جاری کرنے سے ہوں گے۔ اور یا جس کے دل میں ملک کی محبت ایسی ہو۔ کہ وہ نفع اور نقصان کی پروا نہ کرے۔ ہمارے ملک کے ساہوکار جن کا ایمان اور دھرم روپیہ ہے۔ وہ ایسے کاموں میں ابتدا نہیں کر سکتے۔ اس لئے جیسے ملک میں تجارت سے دولت بڑھتی جاتی ہے۔ تو چونکہ روپیہ لگانے کیلئے کارخانے نہیں ہیں۔ تمام روپیہ زمین اور مکانوں کی خریداری پہ لگتا جاتا ہے۔ زمینوں کو ترقی دینے پہ

نہیں - بلکہ بغیر ترقی دینے کے زمینوں کی قیمت بڑھانے پر۔ چنانچہ بعض جگہوں میں ایک روپیہ فی صدی سے بھی کم منافع پر لوگ زمینیں خرید لیتے ہیں۔ محفوظ جائداد بھی سمجھی جاتی ہے۔ کارخانوں میں روپیہ لگانا مخدوش سمجھا جاتا ہے۔

ہندوستان میں ساہوکاری کا پیشہ بہت قدیم زمانے سے ہے۔ یورپ میں یہ کام بعد میں شروع ہوا۔ انگلستان میں پہلے پہل یہ کام اہل اٹلی نے شروع کیا۔ اگر ہندوستان کے ساہوکار جن کو موجودہ زمانے کی اصطلاح میں بنکر کہنا چاہیئے۔ ملک کی صنعت کی طرف متوجہ ہوتے۔ تو روپیہ مہیا کرنے میں انہیں کوئی دقت نہ تھی۔ وہ قدیم زمانے سے سود پر روپیہ قرض دینے کے عادی تھے۔ اور روپے کے لین دین کے رازوں کو سمجھتے تھے۔ صرف اتنی رعایت کی ضرورت تھی۔ کہ کارخانوں کے لئے روپیہ تھوڑے سود پر اور زیادہ مدت کے لئے دیتے رہتے۔ اگر افغانستان جیسے ملک میں صنعت کی طرف توجہ ہو۔ تو ہنر کے علاوہ ان کو یہ دقت بھی پیش آئیگی۔ کہ ایسے لوگ موجود نہیں ہیں۔ جن کے پاس روپیہ جمع ہو۔ اور جن کا پیشہ لوگوں کو قرض دینا ہو۔ اس لئے ان کو قومی بنک بنانے کی ضرورت پیش آئیگی۔ ہندوستان میں ہر شہر اور ہر گاؤں میں جہاں کوئی ساہوکار رہتا ہے۔ وہاں ایک بنک سمجھنا چاہیئے۔ مگر ان ساہوکاروں نے ملک کے فائدے کو کبھی نہیں سمجھا۔ اور ان کا وجود بجائے مفید ہونے کے مضر ثابت ہوا ہے۔ زمینداروں کو ان لوگوں نے سود در سود لیکر ایسا تباہ کیا ہے۔ کہ ہندوستان کے اکثر حصوں میں کوآپریٹو بینک بنانے پڑے ہیں۔ ایسے ہی اگر صنعت کی ترقی کی طرف ملک متوجہ ہوگا۔ تو ہر جگہ میں صنعتی بنک بنانے کی ضرورت پیش آئیگی۔ ان بنکوں کی یہ غرض نہیں ہوگی۔ کہ کارخانہ داروں کو مقروض کر کے ان کے کارخانے بھی بکوا لیں۔

جیسے ساہوکار زمینداروں کے ساتھ کرتے رہے ہیں۔ اور اب بھی کر رہے ہیں۔ بلکہ ان کا منشاء یہ ہوگا۔ کہ کاریگروں اور اہل ہنر کو روپیہ مہیا کرکے نئے کام جاری کروائیں۔ ساہوکاروں نے ایک طرف تو ولایتی کپڑا لا کر ملک کے جولاہوں کو بے روزگار کر دیا دوسری طرف اہل مال ہو کر ملک میں کارخانے بنانے کی طرف توجہ نہ کی۔ تیسری طرف زمینداروں سے بیس اور پچیس فیصدی سود در سود لے کر ملک کے سب سے طاقتور حصہ آبادی کو جو ملک کا دست و بازو ہیں۔ ضعیف کر دیا۔ ساہوکاروں کے بعد قدیم صنعت پیشہ اقوام کی ذمہ واری ہے۔ انگلستان یا دوسرے یورپین ممالک میں اگر ملک کی صنعت کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہوتا ہے۔ تو سب سے پہلے صناع شور و پکار کرتے ہیں۔ اٹھارھویں صدی کے آخیر میں اور انیسویں صدی کی ابتدا میں کپڑے کی مشینیں انگلستان میں جاری ہوئیں۔ جب کبھی کوئی مشین جاری ہوتی تھی۔ تو پرانے دستکار شور و واویلا کرنے کے علاوہ پارلیمنٹ میں درخواست کرتے تھے۔ کہ اس ایجاد سے ہم بے روزگار ہو جائیں گے۔ اس لئے اس کو بند کر دیا جائے۔ چنانچہ سترھویں صدی میں اگر کوئی شخص مشین بناتا تھا۔ تو اسے اس کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ مگر اٹھارھویں صدی کے آخر میں اور انیسویں صدی کے ابتدا میں ملک کے لوگ مشینوں کی خوبی کو سمجھ چکے تھے جب پارلیمنٹ نے ایسے معاملات میں دخل دینا چھوڑ دیا۔ تو دستکاروں نے ہنگامے اور فساد شروع کئے۔ اور کئی مقامات میں زور سے کارخانے بند کر دئے۔ کئی موجدوں کو شہر چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ کئی جگہ ہنگامہ فرو کرنے کے لئے فوج بلانی پڑی جب اس طرح سے کام نہ چلا۔ تو انہوں نے اپنی انجمنیں بنا کر مزدوری کی شرح بڑھانے کیلئے پارلیمنٹ میں چارہ جوئی کی۔

جب پارلیمنٹ نے اس میں بھی دخل نہ دیا۔ بلکہ ان انجمنوں کے وجود کو ملک کے لئے خطرے کا باعث سمجھ کر بند کر دیا۔ تو انہوں نے اپنی کوششوں کو اور طریقوں سے جاری رکھا۔ اور آخر پارلیمنٹ کو انہیں انجمنیں بنانے کی اجازت دینی پڑی۔ جس کا نتیجہ مزدوروں کے ٹریڈ یونین ہیں۔ جو مزدوروں کے حقوق کی حفاظت کے ذمہ وار ہیں"۔ ۱۵ھ ان واقعات سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے۔ کہ انگلستان کے دستکاروں نے اپنی ہستی کی حفاظت کی پوری کوشش کی۔ اور اپنے کام کو آسانی سے مشینوں کے سپرد نہ کیا۔ مشینوں کے ساتھ جو انہوں نے ابتدا میں سلوک کیا۔ اس سے ان کی دانش مندی کا پتہ نہیں چلتا۔ مگر ان کے قوی ارادوں اور مضبوط دلوں کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ واقعات شاہد ہیں۔ کہ ان کی ہستی کو فنا کرنا آسان نہیں تھا۔ اگر یہ لوگ ہندوستان میں ہوتے۔ اور باہر سے مال آکر ان کی صنعت کو تباہ کرتا۔ تو ہر حصہ ملک میں کشت و خون ہو جاتے۔ تاجروں کو جو باہر کا مال بیچتے لوٹ لیتے۔ آخر حکومت وقت کو مجبور ہو کر یا تو ملک میں کارخانے جاری کرنے پڑتے۔ اور یا باہر کا مال بند کرنا پڑتا۔ اور جب باہر کا مال بند کرنے سے دوسرے لوگوں کو نقصان محسوس ہوتا۔ تو آخر کار ملک میں نئے طریق کے کارخانے جاری کرنے پڑتے۔ نتیجہ دونوں صورتوں میں ایک ہی ہوتا۔ برخلاف اس کے جب باہر سے مال آکر اس ملک میں بکنا شروع ہوا۔ اور پرانے صناع بیکار ہو گئے۔ تو ان کی طرف سے ایک آواز بھی بلند نہ ہوئی۔ انہوں نے اس مصیبت کو ایسے صبر اور خاموشی سے قبول

۱۵ھ گروتھ آف انگلش انڈسٹری اینڈ کامرس مصنفہ کنگھم زمانہ حال ص ۲۹۵ و ۶۱۲ و ۶۲۲ و ۶۲۵ و ۶۵۰ و ۶۵۴ و ۶۶۱ و ۶۶۳ و ۶۹۵ و ۷۵۲ ـ

گیا۔ جیسے اور آفات ارضی و سماوی کو کرتے ہیں۔ ملک کے طاعون نے کبھی واویلا نہیں کیا۔ کہ ہم تباہ ہو گئے ہیں۔ ہماری حفاظت کرنی چاہیئے۔ اگر کوئی دستکار بیکار ہو گیا۔ تو جو کام ملا۔ اور جتنی مزدوری ملی۔ اس نے اسی پر قناعت کی۔ اور اگر شکایت کی۔ تو دل میں یا اپنے گھر میں اور وہ بھی اس غرض سے نہیں۔ کہ اس کا علاج ہو۔ بلکہ ایک درد مند شخص کی طرح جو درد کا اظہار اس لئے کرتا ہے۔ کہ اظہار سے اس کے دل کا درد کچھ کم ہو۔ اس کمزوری کی وجہ یہ ہے۔ کہ ہندوستان میں دستکار لوگ وہ ہیں۔ جو ہندوؤں میں ذلیل ترین لوگ خیال کئے جاتے ہیں۔ اور جن کے ساتھ اعلیٰ ذات کے ہندو کھانا پینا تو درکنار چھونا بھی گوارا نہیں کرتے۔ یہ لوگ صدیوں کے دباؤ کی وجہ سے ایسے پست ہمت اور بزدل ہو گئے ہیں۔ کہ انہیں مقابلہ کرنے یا اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے کی جرأت ہی نہیں ہو سکتی۔ ایک نیچ ذات کے لئے اعلیٰ ذات کے سامنے کھڑے ہو کر برابر حقوق کا دعویٰ کرنا اپنے لئے نہ صرف اس دنیا میں ہلاکت مول لینا ہے۔ بلکہ آئندہ تمام جنموں میں عذاب خریدنا ہے۔ ہر شخص نے دیکھا ہوگا۔ کہ یہ لوگ ہر ایسے آدمی کو جو ذرا صاف کپڑے پہنے ہو۔ کس طرح جھک کر سلام کرتے ہیں۔ اور کس طرح عاجزی سے اس کے ساتھ بات چیت کرتے ہیں۔ یہ عاجزی بناوٹ نہیں۔ بلکہ ان کی اصلی حالت کا اظہار ہے۔

مسلمانوں اور سکھوں میں جو دستکار قومیں ہیں۔ وہ باقی قوموں کے مقابلے میں ایسی ذلیل نہیں سمجھی جاتیں۔ جیسے ہندوؤں میں مگر کم حیثیت ضرور خیال کی جاتی ہیں۔ پنجاب میں جولاہے اپنی بزدلی اور بیوقوفی کے لئے ضرب المثل ہیں۔ لوہاروں اور بڑھیوں کی اقوام اتنی ذلیل نہیں سمجھی جاتیں۔ اور اس لئے وہ اتنی پست ہمت

بھی نہیں ۔ ان اقوام سے توقع ہو سکتی تھی ۔ کہ جب یورپ کی صنعت نے ملک پر حملہ کیا تھا۔ تو وہ اس کی حفاظت کرتے ۔ نیا ہنر سیکھتے اور نئی طرز کی چیزیں بناتے ۔ مگر ان اقوام میں تعلیم بہت کم ہے ۔ روپیہ بھی کم ہے ۔ اس لئے اگرچہ ان کا طبعی رجحان صنعت کی طرف ہے۔ انہوں نے نئی صنعت کے سیکھنے کی بہت کوشش نہیں کی ۔ پھر بھی بعض بعض جگہوں میں بغیر علمی طور پر ہنر سیکھنے کے جو یورپین صنعت کی نقل کی ہے ۔ وہ یہ ثابت کرتی ہے ۔ کہ یہ اقوام ملک کے لئے بے بہا خزانہ ہیں ۔ اگر ان کے طبعی رجحان کو جو صدیوں ایک پیشے میں رہ کر پیدا ہوا ہے ۔ ترقی دی جائے ۔ اور موجودہ علم سائنس اور عملی فنون کی ان کو تعلیم دی جائے ۔ تو ملک کی ترقی کا بہترین ذریعہ ہو سکتے ہیں ۔ پنجاب میں قابل ذکر کوشش جو ان قوموں نے بغیر تعلیم اور بغیر بیرونی امداد کے محض اپنی ہمت سے کی ہے ۔ وہ سیالکوٹ کا کرکٹ ہاکی ٹینس وغیرہ کھیل کا سامان ہے ۔ اور نظام آباد میں چاقو چھریوں کا کام ۔ سیالکوٹ میں ۱۸۷۰ء کے قریب پہلے پہل ایک شخص مستری نظام الدین نے کسی انگریز کا ریکٹ مرمت کیا۔ اس کے بعد اسے خود ریکٹ بنانے کا شوق پیدا ہوا ۔ اور جب تک زندہ رہا یہی کام کرتا رہا ۔ جب وہ مر گیا ۔ تو اس کے رشتہ داروں میں سے جن لوگوں نے کام سیکھ لیا تھا ۔ کام جاری رکھا ۔ اور آہستہ آہستہ اس کام کے کرنے والے کارخانے بڑھتے گئے ۔ یہاں تک کہ اب ایک ہزار سے بھی زیادہ آدمی اس کام پر لگے ہوئے ہیں ۔ اور شہر کی خوشحالی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے ۔ چنانچہ یہاں کا مال انگلستان میں جا کر بکتا ہے ۔ اسی طرح نظام آباد میں جو چاقو اور چھریاں بنتی ہیں ۔ وہ بھی ملک کے لوہاروں نے بغیر بیرونی امداد کے بنائی ہیں ۔ مگر یورپ کا ہنر سیکھنے کے بغیر ایسی کوششیں ہمیشہ اور ہر فن میں کامیاب نہیں ہو سکتیں ۔ افسوس ہے ۔ کہ ان لوگوں

میں تعلیم کم ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ افسوس اس بات کا ہے۔ کہ ملک میں نوکری پیشہ لوگوں کا اثر اتنا زیادہ ہے۔ کہ ان اقوام میں سے اگر کوئی اعلیٰ تعلیم حاصل کر لیتا ہے۔ تو اپنا آبائی پیشہ چھوڑ کر بابو یا تحصیلدار یا ڈپٹی بننے کی کوشش کرتا ہے۔ غرضیکہ صنعت پیشہ اقوام میں سے ایک حصّے نے تو کم ہمتی کی وجہ سے اپنا پُرانا ہنر چھوڑ دیا۔ اور نیا ہنر سیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اور جو حصّہ زیادہ باہمت ہے۔ وہ غربت کی وجہ سے اور تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے پوری کوشش نہیں کر سکا۔ اور جو ان میں سے تعلیم پا جاتے ہیں۔ وہ باقی ملک کے تعلیم یافتہ گروہ کے مہلک اثر کی وجہ سے کچھ نہیں کر سکتے۔

آخری اور سب سے بھاری ذمہ واری تعلیم یافتہ گروہ کی ہے تعلیم یافتہ گروہ ہی یورپ کی طاقت کا راز سمجھ سکتا تھا۔ اور وہ ملک کو توجہ دلا سکتا تھا۔ کہ حقیقی ترقی کی راہ کونسی ہے۔ تعلیم یافتہ گروہ نے اگرچہ یورپین تعلیم کی طرف ملک کی توجہ بہت کرائی ۱۸۱۷ء میں راجہ رام موہن رائے نے انگریزی تعلیم کے لئے کالج قائم کیا۔ ۱۸۸۵ء میں سیاسی حقوق کا مطالبہ کرنے کے لئے کانگرس قائم ہوئی مگر صنعتی کانفرنس جو مسٹر رانا ڈے کی تحریک کا نتیجہ تھی۔ ۱۸۹۱ء سے پہلے قائم نہ ہو سکی۔ اس کے دو اجلاس ۱۸۹۲ء اور ۱۸۹۳ء میں ہوئے۔ مسٹر رانا ڈے ہائی کورٹ کے جج بن گئے۔ اور یہ کانفرنس ۱۹۰۵ء تک بند رہی۔ ۱۹۰۵ء میں پھر شروع ہوئی۔ اس کانفرنس کے مقاصد یہ ہیں۔ گورنمنٹ کے سامنے ملک کی صنعت اور زراعت کی ترقی کی تجاویز پیش کرنا۔ سالانہ جلسے کر کے ملک کے لئے مفید تجاویز پاس کر کے شائع کرنا۔ صنعتی امور کے متعلق واقفیت بہم پہنچا کر شائع کرنا۔ گویا صنعتی کام کی طرف ملک کی مجموعی کوشش تعلیمی کوشش کے قریباً اسی نوے برس بعد شروع ہوئی ہے۔ مگر انڈسٹریل کانفرنس کی کوشش صرف ایک تحریک کے رنگ میں ہے۔ جس کا ابھی تک اثر

ملک پر زیادہ نہیں ہوا۔ انتظامی کوشش کی طرف ابھی تک توجہ نہیں ہوئی۔

تعلیم یافتہ جماعت کے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ تو اپنا یہ فرض سمجھتا ہے۔ کہ مغربی علوم کی کتابی تعلیم حاصل کر کے سرکاری ملازمت اختیار کر لے۔ اور دوسرے فریق کا یہ خیال ہے۔ کہ سیاسی حقوق کا حاصل کرنا سب سے زیادہ ضروری ہے۔

جو لوگ سرکاری ملازمت کی طرف متوجہ ہیں۔ وہ اکیلے قصوروار نہیں۔ اگرچہ ملک کی حقیقی خیر خواہی کو مدنظر رکھا جائے۔ تو وہ پورے قصوروار ہیں۔ سرکاری ملازمت کی طرف لوگ اس لئے مائل ہیں کہ تنخواہیں زیادہ ہیں۔ کیونکہ گورنمنٹ ہند کو انگریزوں کو زیادہ تنخواہیں دینی پڑتی ہے۔ اس لئے دیسیوں کی تنخواہیں بھی اسی نسبت سے مقرر کرنی پڑتی ہیں۔ اس سے دو طرح کا نقصان ہے۔ ایک تو یہ کہ سول سروس کی تنخواہوں کی وجہ سے ملک زیر بار ہو گیا ہے۔ دوسرا یہ کہ ہندوستانی نوجوانوں میں سے اکثر ہوشیار اور ذہین طالب علم سرکاری ملازمت میں لگ جاتے ہیں۔ اور ملک کی بہتری کے کام نہیں کر سکتے۔ ابھی ذکر ہو چکا ہے۔ کہ مسٹر راناڈے کے جج بن جانے سے بارہ برس تک انڈسٹریل کانفرنس ملتوی رہی۔ صاف ظاہر ہے۔ کہ مسٹر راناڈے کے کام سے جو فائدہ ملک کی صنعتوں کو پہنچا۔ وہ ان کی ججی سے نہیں پہنچا۔ اسی طرح بہت سے مفید آدمی جو اگر اپنے حال پر چھوڑ دئے جاتے۔ تو ملک کی رہنمائی کا کام کرتے۔ سرکاری ملازمت میں داخل ہو کر ملک کے لئے بے کار ہو جاتے ہیں۔ اور ملکوں میں یہ حال ہے۔ کہ تنخواہوں کی کمی کی وجہ سے سرکاری عہدوں کے لئے ملازم نہیں ملتے۔ انگلستان میں سرکاری ملازموں کی تنخواہیں بہت کم ہیں۔ وزیر ہند کی تنخواہ جو خزانہ انگلستان سے ملتی ہے۔ پانچ ہزار پونڈ سالانہ ہے۔ اور وائسرائے

کی تنخواہ جو خزانہ ہند سے ملتی ہے ۔ ۲۵۶۰۰۰ روپیہ سالانہ ہے۔
جو ۱۵ روپے فی پونڈ کے حساب سے ، ۱۷ ہزار پونڈ سالانہ سے زیادہ
بنتی ہے ۔ اور دس روپے فی پونڈ کے حساب سے پچیس ہزار پونڈ
سالانہ سے زیادہ ہے ۔ اسی طرح ہر ایک گورنر کی تنخواہ ایک لاکھ بیس ہزار
روپیہ سالانہ ہے ۔ جو ۱۵ روپے فی پونڈ کے حساب سے آٹھ ہزار پونڈ
سالانہ بنتی ہے ۔ اور دس روپے فی پونڈ کے حساب سے ۱۲ ہزار پونڈ
سالانہ ۔ فرانس اور جرمنی میں بہت قلیل تنخواہیں ہیں ۔ یہاں تک
کہ جرمنی میں سرکاری کاموں کے لئے آدمی نہیں ملتے ۔ اگر وزیر ہند
اور دوسرے انگلستان کے وزراء کی تنخواہوں کی حقیقی قیمت کو
دیکھا جائے ۔ تو وہ ہندوستان میں ایک ہزار روپیہ ماہوار ہونگی
کیونکہ انگلستان اور ہندوستان میں اشیاء کی قیمت میں کم ازکم
پانچ اور ایک کی نسبت ہوگی ۔ جو طالب علم ہندوستان میں پچاس
روپے ماہوار پر گذارا کرتا ہے ۔ اسے انگلستان میں تین سو روپے
ماہوار سے بھی زیادہ درکار ہے ۔ جاپان اور ہندوستان کے سرکاری
عہدوں کی تنخواہوں کا مقابلہ سبق آموز ہے ۔ جاپان اور ہندوستان
میں رہائش کھانے پینے وغیرہ کا خرچ قریباً ایک ہی سا ہے ۔ جاپان
میں چیف جسٹس کی تنخواہ پانچ سو پونڈ سالانہ ہے ۔ اور اس سے
زیادہ کسی عہدہ کی تنخواہ نہیں ۔ ہندوستان میں کلکتہ کے چیف
جسٹس کی تنخواہ ۷۲ ہزار روپیہ سالانہ ہے ۔ اور باقی صوبوں کے
چیف جسٹس کی تنخواہ ساٹھ ہزار روپیہ ۔ گویا ہندوستان کے ہر
چیف جسٹس کی تنخواہ جاپان کے چیف جسٹس ۔ بلکہ بڑے سے بڑے
عہدہ دار سے آٹھ گنا ہے ۔ یا دوسرے لفظوں میں سب سے
بڑے عہدہ دار کی تنخواہ وہ ہے ۔ جو ہندوستان میں ایک
آئی اے سی کو ابتدائی مراحل میں ملتی ہے ۔ فوجی تنخواہوں
کا مقابلہ اور بھی نتیجہ خیز ہے ۔ ظاہر ہے ۔ کہ جاپان کی فوج کسی

یورپین فوج سے لڑائی میں کم نہیں ۔۱۶ھ

ماہواری تنخواہ

جرنیل	۵۲۵	ین
نائب جرنیل	۳۵۲	″
میجر جرنل	۲۷۵	″
کرنل	۱۸۹	″
لفٹننٹ کرنل	۱۵۴	″
میجر	۱۰۹	″
کپتان	۷۵	″
لفٹنٹ	۴۹	″
سیکنڈ لفٹنٹ	۳۳ ½	″

دس ین ایک پونڈ کے برابر ہوتے ہیں ۔

گویا ہندوستان کی فوج میں ایک لفٹنٹ کی تنخواہ جاپان کے جرنیل کے برابر یا بعض صورتوں میں زیادہ ہے ۔ اور ملکوں میں سرکاری ملازمت میں صرف اتنی تنخواہ دی جاتی ہے ۔ جو گذارے کے لئے کافی ہو ۔ ہندوستان میں سرکاری ملازمت دولت پیدا کرنے کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے ۔ جس ملک میں دولت پیدا کرنے کا ذریعہ وہ کام سمجھے جائیں ۔ جو حقیقت میں دولت کے خرچ کرنے کے راستے ہیں ۔ تو اس ملک کا دیوالہ نکلنے میں کچھ دیر نہیں لگتی ۔ گورنمنٹ کے دفاتر ملک کے لئے دولت پیدا کرنے کے لئے نہیں بنائے گئے بلکہ دولت کی حفاظت کے لئے بنائے گئے ہیں ۔ اگر محافظ ہی بہت سا حصہ لے لیں ۔ تو ملک کے پاس کیا رہے گا ۔

سرکاری عہدوں کی تنخواہوں کا زیادہ ہونا ہندوستانی

۱۶ھ جاپان (این انٹرپریٹیشن) مصنفہ ایل ہرن ص ۵۰۳ ۔

نوجوانوں کے لیئے ایک لالچ تو ضرور ہے۔ مگر اس لالچ سے بچنا بہت مشکل نہیں ہے۔ تو یہ ہے۔ کہ ابھی اکثر تعلیم تعلیمیافتہ نوجوانوں کی نظر روپے اور مال سے آگے نہیں جاتی۔ ابھی تک روپے اور آرام کا شوق غالب ہے۔ اور طبائع کام کی طرف راغب نہیں عموماً جو طالب علم کالجوں میں تعلیم پاتے ہیں۔ وہ علوم کو بھی سکے کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ علوم کو خالص علوم کی حیثیت سے نہیں دیکھتے۔ یہ غرض کم ہے۔ کہ کسی بات میں کمال پیدا کریں۔ اگر کلج میں محنت کرتے ہیں۔ تو بھی اس لیئے کہ اس سے آسودہ ہو جائیں۔ جب کالجوں کو چھوڑ کر ملازم ہو جاتے ہیں۔ تو شاذونادر ہی کوئی علوم کو جاری رکھتے ہیں۔ علوم تو درکنار جس ملازمت کو اختیار کرتے ہیں۔ اس میں بھی صرف اتنی محنت کرتے ہیں جتنی مقررہ ترقی حاصل کرنے کے لیئے ضروری ہو۔ گورنمنٹ کے انتظامی عہدہ داروں کے لیئے بھی گنجائش ہے۔ کہ وہ مطالعے سے تمام ممالک کے انتظامی طریقوں سے واقفیت پیدا کریں۔ نئے انتظامی طریقے ایجاد کریں۔ وہی کام تھوڑے آدمیوں۔ تھوڑے خرچ تھوڑی تکلیف اور زیادہ خوبی سے انجام دینے کی تدابیر کریں۔ جو اب زیادہ خرچ اور زیادہ تکلیف سے ہوتا ہے۔ مگر ہندوستانی عہدہ داروں میں سے شاذ ہی کوئی ایسا ہوتا ہوگا۔ جو دفتر کا کام کرکے محض شوق کے لیئے کسی ایسے کام کی طرف متوجہ ہوتا ہو۔ ڈاکٹروں کا بھی یہی حال ہے۔ جو کالج کی زندگی میں حاصل کیا۔ عموماً اسی پر گذارا ہے۔ یا جو بات اتفاق سے سول سرجن کی زبان سے معلوم ہو جائے۔ ایسا ہی عموماً ہر پیشے میں حال ہے۔ جہاں یورپ کا خاصہ بڑھنا اور ہر روز نئی ترقی کرتا ہے۔ وہاں ہندوستان کا خاصہ جمود ہے۔ اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ کام کی محبت دل میں پیدا نہیں ہوتی۔ ابھی روپے اور آرام

ہی کی محبت ہے۔ بغیر کام کی محبت کے کسی قسم کی ترقی نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی شخص کی غرض محض روپیہ حاصل کرنا ہے۔ تو وہ اس کام پر جس سے اسے روپیہ حاصل ہونے کی امید ہے۔ صرف اتنی محنت کرے گا۔ جتنی روپیہ دلوانے کے لئے ضروری ہے۔ اگر اسے اس کام کے کرنے کا شوق ہو۔ تو وہ روپے کی پرواہ نہیں کرے گا۔ اور اس کام کو ایسی خوبی سے کرے گا۔ کہ اس سے زیادہ ممکن نہ ہو۔ یہی یورپ کی ترقی کا راز ہے۔ کہ یورپ میں بہت سے لوگ ہیں۔ جنہیں کام کی محبت ہے۔ وہ بھوک پیاس غربت برداشت کرکے بھی اپنی دھن میں لگے رہتے ہیں۔ اور اس کام کو کرکے چھوڑتے ہیں۔ جس کا انہیں شوق ہو۔ صنعت اور حرفت اور تجارت بھی اگرچہ عام طور پر لوگوں کا خیال ہے۔ کہ یہ محض روپے حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ مگر ان فنون میں بھی ترقی تب ہی ہو سکتی ہے۔ جب غرض روپیہ نہ ہو۔ پروفیسر الفریڈ مارشل لکھتے ہیں۔ کہ "امریکہ میں بہت سے آدمی ہیں۔ جو جوانی ہی میں مالدار ہو گئے ہیں۔ ابھی ان کا کام کا شوق تازہ ہے۔ انہیں عیش و تفریح کی طرف کوئی رغبت نہیں۔ انہیں حقیقی خوشی اس وقت ہوتی ہے جب وہ اپنے کاروبار میں مصروف ہوتے ہیں۔ اور اپنی دولت کے بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر ان کی دولت کے بڑھانے کی غرض صرف یہ ہے۔ کہ ان کی انتظامی قابلیت کا اظہار ہو۔ جیسے سائنس اور ہنر میں ترقی تب ہوتی ہے۔ جب اہل علم اور اہل فن اپنے برادران فن کی تحسین کے لئے کام کریں۔ نہ کہ روپے کی خاطر۔ اسی طرح کاروبار میں ترقی تب ہوتی ہے۔ جب تاجر کا مدعا دوسرے تاجروں کے سامنے اپنی قابلیت کا عملی اظہار کرنا ہو۔ نہ کہ عیش کی مجالس میں اپنی شان دکھانا۔" امریکہ کے نوجوانوں کی نسبت پروفیسر مارشل لکھتے ہیں۔ کہ "طبعاً نوجوان اس پیشے کی طرف

رخ کرتے ہیں۔ جس پیشے میں مشکلات زیادہ ہوں۔ اور ان مشکلات پر عبور کرنے سے سب سے زیادہ امتیاز پیدا ہو"۔ ہندوستان کے نوجوانوں کا حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ اس پیشے کیطرف رخ کرتے ہیں۔ جس میں کامیابی کے لئے کوئی تکلیف نہ کرنی پڑے اور آمدنی ایسی یقینی ہو۔ جیسے سورج کا نکلنا۔ اگر امریکہ کے مشہور کارخانوں کی فہرست بنائی جائے۔ تو معلوم ہوگا۔ کہ ان میں سے ہر ایک کا بانی ایسا شخص تھا۔ جس نے اپنی زندگی کی ابتدا معمولی کاریگر کلارک یا چپڑاسی کی حیثیت سے کی ہو۔ جرمنی کی صنعتی ترقی کا سب سے بڑا سبب اس کے سائنس دان ہیں۔ جنہوں نے عملی طریقوں کو وہ ترقی دی۔ کہ تمام ممالک سے سستا اور عمدہ مال تیار ہوتا ہے۔ غرضیکہ صنعتی ترقی کے لئے ان صفات کی ضرورت ہے۔ جو ہندوستانی نوجوانوں میں کم ہیں۔ ہندوستان کی صنعتوں میں ترقی تب ہو سکتی ہے۔ جب ایک کثیر تعداد ایسے نوجوانوں کی پیدا ہو جائے۔ جو روپے پیسے اور آرام کا خیال چھوڑ کر اس بات کا تہیہ کرلیں۔ کہ جب تک وہ کوئی نیا ہنر ملک میں جاری نہ کرلیں گے۔ ان کی زندگی کا مقصد پورا نہ ہوگا۔ صرف یہی کافی نہیں کہ گورنمنٹ کے خرچ پر دو تین سال یورپ میں رہ کر واپس آجائیں اور واپس آکر شکایت کریں۔ کہ کارخانہ دار ہمیں سکھانے میں تامل کرتے تھے۔ اور پھر گورنمنٹ کے پاس ملازمت کے خواستگار ہوں۔ جرمنی کو جب انگلستان سے ہنر سیکھنے کی ضرورت تھی۔ تو جرمن کاریگر انگریزی کارخانوں میں جا کر ملازمت کر لیتے تھے۔ خواہ کیسا ہی ذلیل کام ملے۔ اور خواہ کیسا ہی قلیل معاوضہ ہو۔ وہ اس وقت تک نہیں نکلتے تھے۔ جب تک کارخانے کے اندرونی رازوں کو چپکے چپکے معلوم نہ کرلیں۔ مگر جو طالب علم اس انتظار میں رہتے ہیں۔ کہ کارخانہ داران کو خوش آمدید کہہ کر ہیروں کی طرح کرسی

پر بٹھائیں۔ ان کی خاطر بھی کریں۔ اور برس چھ مہینے میں انہیں سکھا کر گھر واپس کر دیں۔ وہ سیکھنے کی امید نہ رکھیں۔ یہ شاید یہ سمجھ کر جاتے ہیں۔ کہ یورپ کے کارخانہ داروں کے ذمہ ان کا فرض ہے۔ جو انہیں بلا توقف ادا کر دینا چاہیئے۔

ہندوستانی نوجوانوں میں اگر قربانی کا مادہ پیدا ہوا ہے۔ تو وہ صرف سیاسی اغراض کے لئے آج کل ہندوستان میں سیاسی حقوق کے مطالبے کا اتنا زور ہے۔ کہ کسی اور تحریک کا سننا بھی غالباً لوگوں کو گوارا نہ ہوگا۔ مگر صنعتی ترقی ملک کے لئے سیاسی حقوق سے کم ضروری نہیں۔ اور صنعتی ترقی کے لئے بھی ویسی ہی قربانی کی ضرورت ہے۔ جیسی سیاسی حقوق کے حاصل کرنے کے لئے۔

سیاسی حقوق کا مطالبہ کرنے والی دو جماعتیں ہیں۔ ایک تو وہ ہیں۔ جو گورنمنٹ سے شکایت و مطالبہ بحث و مباحثہ سے حقوق حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور دوسرے وہ جو عدم تعاون کے ذریعہ سے حقوق حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ عدم تعاون کی انتہائی تدبیر یہ ہے۔ کہ حکومت کے احکام کی نافرمانی کی جائے۔ ہاتھوں سے حکومت کے خلاف کچھ نہ کیا جائے۔ مگر خاموشی اور امن سے اس کے احکام کو نہ مانا جائے۔ ایسے ہی دلائل سے اہل وطن کو اس بات پر آمادہ کیا جائے۔ کہ غیر ملکی کپڑا نہ پہنیں۔ شراب نہ پئیں وغیرہ۔ اس کا نام روحانی مقابلہ بھی رکھا گیا ہے۔ اگر گورنمنٹ زیادتی کرے۔ تو صبر و تحمل سے برداشت کیا جائے۔ یہاں تک کہ حق اپنی قوت سے خود باطل پر غالب آجائے۔ عدم تعاون و عدم تشدد کے متعلق تین باتیں قابل غور ہیں۔ ایک یہ کہ گورنمنٹ ملک کے ساتھ پورا عدم تعاون وہ لوگ کر سکتے ہیں۔ جو اقتصادی طور پر گورنمنٹ کے محتاج نہ ہوں۔ جن میں سے اکثروں کا گذارا گورنمنٹ کی ملازمت پر نہ ہو۔ اگر گورنمنٹ کے ملازموں کی تعداد کم ہو۔ اور ان کی تنخواہیں

بھی کم ہوں۔ اور باقی اہل ملک امیر ہوں۔ اور ان کا گذارا صنعت یا اعلیٰ درجہ کی زراعت کی پیداوار پر ہو۔ تو وہ اس قلیل حصہ ملازمین گورنمنٹ کا خرچ برداشت کر سکتے ہیں۔ مگر جس ملک میں اپنی صنعت نہ ہو۔ اور تاجروں کی دولت بھی انگلستان سے آتی ہو گویا وہ بھی اقتصادی طور پر گورنمنٹ کے محتاج ہوں۔ اور ملک کے مال دار لوگ وکیل یا سرکاری عہدہ دار یا سرکاری ٹھیکیدار ہوں جو سب گورنمنٹ کے محتاج ہیں۔ اور آزاد حصہ صرف غریب کاشتکاروں کا ہو۔ تو ایسا ملک عدم تعاون یا گورنمنٹ سے قطع تعلق نہیں کر سکتا دوسری یہ کہ جب تک ایک فریق خواہ اس کی تعداد کتنی ہی کم ہو حکومت کے ساتھ رہے گا۔ اس طریقے سے سوائے ناراضگی کے اظہار کے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ایسے لوگوں کی تعداد جو قومی یا سیاسی یا مذہبی اغراض کے لئے اپنے عیش و آرام۔ امن اور جان کو خطرے میں ڈال سکیں۔ ہمیشہ اور ہر ملک میں کم ہوتی ہے۔ اکثر حصہ لوگ خواہ معتقد بھی ہوں۔ اپنے مال و جان کی قربانی نہیں کر سکتے بلکہ انقلاب ہمیشہ ایک قلیل تعداد کے ہاتھ سے ہوتے ہیں۔ جو قربانی کی اہلیت رکھتے ہیں۔ باقی لوگ جو امن پسند ہوتے ہیں۔ وہ روپے کی طمع سے یا نقصان کے ڈر سے ان کے پیچھے ہو جاتے ہیں۔ غرضیکہ ایسے لوگوں کی تعداد جو اپنے مقصد کے لئے مال و جان کو قربان کر دیں ہمیشہ تھوڑی ہوگی۔ یہ ایک قسم کا انسانی فطرت کا قانون ہے جو انقلاب پیغمبر صلعم کے وقت میں ہوا۔ وہ بھی ایک قلیل تعداد صحابہ کا کام تھا۔ بہت سارے لوگ جو ان کے ساتھ بعد میں مل گئے تھے۔ وہ فتوحات کے طمع سے یا صحابہ کے ڈر سے ساتھ شامل ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ اہل عرب جو ساتھ شامل ہوئے۔ ان کو مومن بھی تسلیم نہیں کیا گیا۔ بلکہ صرف مسلم کہا گیا۔ قالت الاعراب آمنا قل لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا۔ ایسے ہی صحابہ کے ساتھ

رہنے والوں میں سے جو لوگ مال وجان کی قربانی نہیں کر سکتے تھے۔ حالانکہ معتقد تھے۔ منافق کہلاتے تھے۔ اور ان کی بڑی تعداد معلوم ہوتی ہے۔ فرانس کا انقلاب بھی ایک قلیل جماعت کے اثر سے ہوا۔ باقی ملک راضی تھا۔ مگر خود کچھ کرنے کے لئے تیار نہیں تھا پہلی حکومت پر بھی ایسا ہی قانع تھا۔ جیسا دوسری پر۔ روس کا موجودہ انقلاب بھی ایک چھوٹی جماعت کی وجہ سے ہوا ہے۔ جس کی تعداد چھ لاکھ کے قریب ہے۔ جس نے منتظم و مسلح ہونے کی وجہ سے تمام ملک پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ باقی لوگ کچھ خوش ہیں۔ اور جو ناراض ہیں۔ خاموش بیٹھے ہیں۔ انگلستان یا فرانس جیسے پرانے منتظم اور طاقت ور ملکوں میں بھی ایسے لوگ جو ملک کی خاطر سب کچھ قربان کرنے کے لئے اپنی مرضی اور اپنی تحریک سے تیار ہوں تھوڑے ہیں۔ مگر جب یہ لوگ کسی بات کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ تو باقی لوگ جو سب ان کے زیر اثر ہیں۔ ان کے رعب اور اخلاقی ڈر کی وجہ سے قربانی کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ باوجودیکہ انگلستان کے لوگ قربانی کرنے میں بہت مشاق ہیں۔ اور حب قومی ان میں بہت ترقی یافتہ ہے۔ مگر دوران جنگ میں جب سپاہیوں کی ضرورت پڑی۔ تو انگلستان میں اپنی رضامندی سے آنے والے سپاہیوں کی تعداد کافی ثابت نہ ہوئی۔ اور حکومت انگلستان کو جبری بھرتی کا قانون جاری کرنا پڑا۔ جس کا نام کنسکرپشن رکھا جاتا ہے۔ اب عدم تعاون کی تحریک میں یہ کمی ہے۔ کہ اگر یہ واقعی عدم تشدد پر کاربند ہوں۔ اور طمع یا دھمکی سے کام نہ لیں۔ تو ان کے پاس کثیر حصہ ملک کو ساتھ لینے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ جو باوجود ہمدردی اور مالی امداد دینے کے اپنے آپ کو خطرے سے بچائے رکھیگا۔ تشدد والی تحریکوں میں تھوڑے آدمیوں کی آمادگی کافی ہے۔ اسکے عدم تشدد کی تحریک میں تمام ملک کی آمادگی ضروری ہے۔ جو کبھی ممکن نہیں۔ زبانی آمادگی تو ممکن ہے۔ مگر تمام ملک سے

مال اور جان کا نقصان اٹھانے کیلئے آمادہ ہو جانا ممکن نہیں۔ اگرچہ عدم تعاون و عدم تشدد میں دوسرے کی جان لینے کی اجازت نہیں مگر اپنی جان دیدینے کا حکم ہے۔ اس وجہ سے اور بھی کم لوگ ایسی قربانی کے لئے فطرتاً تیار ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ خیال ہو۔ کہ جہاں خود مریں گے۔ وہاں دس پانچ کو مار کر مریں گے۔ تو ایسے نقصان کے لئے بہت لوگ تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر جہاں صرف جان دینے کا حکم ہو۔ جان لینے کی اجازت نہ ہو۔ وہاں اور بھی کم لوگ تیار ہوتے ہیں۔ جب دو فریقوں کا مقابلہ ہو۔ جن میں سے ایک عدم تشدد پر کاربند ہو۔ اور دوسرا تشدد کو جائز سمجھتا ہو۔ تو عوام الناس جو اپنے امن کو عزیز سمجھتے ہیں عملاً تشدد والے فریق کے ساتھ ہونگے کیونکہ انہیں اس فریق سے نفع کی امید یا نقصان کا ڈر ہے۔ خواہ ان کے دل دوسرے فریق کے ساتھ ہی ہوں۔ ابھی تک حامیان عدم تعاون کا پورا امتحان نہیں ہوا۔ مار کھانا جیل میں جانا ایسا بڑا امتحان نہیں ہے۔ جیسا جان کا دینا۔ قانون فطرت چاہتا ہے۔ کہ خوشی سے بغیر کسی کو نقصان پہنچائے۔ پھانسی قبول کرنے والوں کی تعداد اور بھی کم ہوگی۔ یہ ایک دلچسپ مرحلہ ہے۔ کہ ہر ملک میں اپنے مقاصد عالیہ کی۔ خاطر کتنے لوگ اپنی جان اور مال قربان کرنے کیلئے تیار ہیں۔ غالباً منتظم ممالک میں نسبتاً تعداد زیادہ نکلے گی۔ اور غیر منتظم ممالک میں جیسا کہ ہندوستان ہے۔ کم ہوگی۔ ایسے ہی بعض مقاصد کے لئے زیادہ تعداد ہوگی اور بعض کے لئے کم۔ جو مقصد زیادہ محبوب ہوگا۔ اس کے لئے زیادہ قربانی ہوگی۔ اور جو کم محبوب ہوگا۔ اس کے لئے کم۔ چنانچہ اگر ہر شخص کو اپنی جان اور مال کے نقصان ہونے کا خطرہ ہو۔ تو بہت کم لوگ ہوں گے۔ جو ان چیزوں کو قربان کر کے بے خطر ہو کر ان کی حفاظت نہ کریں گے۔ رونا اور واویلا کرنا صرف اسی وقت تک ہوگا۔ جب تک یہ خیال

ہو۔ کہ اس طریقے سے جان و مال بچ سکتے ہیں۔ جب یہ یقین ہو جائے کہ یہ نہیں بچ سکتے۔ تو بزدل سے بزدل انسان بھی دلیر ہو جاتا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے۔ کہ وعظ و نصیحت سے جب مقصد کی محبت لوگوں کے دلوں میں مضبوط ہو جاتی ہے۔ تو زیادہ لوگ قربانی کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر غالباً جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں۔ ایسے لوگوں کی ایک محدود تعداد ہوتی ہے۔ اور کسی طریقے سے بھی وہ اس حد سے متجاوز نہیں ہو سکتی۔ ایک دوسرا فریق ایسے آدمیوں کا ضرور رہتا ہے۔ جو اپنے امن و آرام۔ جان و مال کو زیادہ عزیز سمجھتے ہیں اور وہ اسی فریق کے عملاً حامی ہوں گے۔ جس سے نفع یا ضرر کی امید ہو سکتی ہے۔ جس کے پاس طاقت ہے۔ اور جس کا عمل تشدد پر ہے

بفرض محال اگر مان لیا جائے۔ کہ ملک کا ہر فرد بشر قطع تعلق کرنے کے لئے آمادہ ہو سکتا ہے۔ تو یہ تو سمجھ میں آ سکتا ہے۔ کہ غیر قوم کے قبضے کو مضبوط کرنے میں اہل ملک اعانت نہ کریں۔ مگر اعانت نہ کرنیکا یہ لازم نتیجہ نہیں۔ کہ وہ قبضہ اٹھ جائیگا۔ اگر وہ قوم بغیر ملکی لوگوں کی امداد کے صرف اتنی جگہوں پر قابض رہے۔ جن کے لئے ان کے آدمیوں کی تعداد کفایت کرتی ہے۔ اور باقی تمام علاقوں کو وقتاً فوقتاً تہ تیغ کر کے ویران کرتی رہے۔ تو انہیں اس سے روکنے کا کیا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ دلائل سے قائل کرنا یا ان کے اس فعل کی اخلاقی مذمومیت کا ثابت کرنا کافی نہیں ہوگا۔ اور اس کے سوائے کوئی اور روحانی طریق سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

پائے استدلالیاں چوبین بود
پائے چوبین سخت بے تمکین بود

اقوام دنیا ابھی اس درجہ پر نہیں پہنچیں۔ کہ اپنے حقوق کا تصفیہ محض دلائل و بحث مباحثہ سے کر سکیں۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ مسیح اور بدھ کی مثالیں موجود ہیں۔ کہ جنہوں نے اپنے دشمنوں

کو محض دلائل سے قائل کر کے مغلوب کر لیا۔ مگر ان کا مقصد ملک گیری نہ تھا۔ بلکہ صرف لوگوں کے خیالات کی اصلاح کرنا تھا۔ خیالات کی اصلاح صرف دلائل ہی سے ہو سکتی ہے۔ اس وقت بھی مذہبی مصلح صرف دلائل سے لوگوں کے خیالات میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں مگر کسی قوم سے اس کے مال یا اس کی قوت کا چھیننا دلائل سے نہیں ہو سکتا۔ قوم تو درکنار کسی فرد پر بھی اتنا اثر نہیں ڈالا جا سکتا۔ کہ وہ بغیر کسی امید کے اپنا مال اور قوت دوسرے آدمی کے سپرد کر دے۔ جب یہ حالت ہے۔ تو اس طریقے سے سوراج کا حاصل کرنا کس طرح آسان یا ممکن ہو سکتا ہے۔ اگر اس طریق سے فائدہ ہو سکتا ہے۔ تو یہی ہو سکتا ہے۔ کہ کچھ زائد حقوق مل جائیں۔ پھر ان کا نام خواہ سوراج رکھ دیا جائے۔ یا کچھ اور۔ اس طریق سے ایک سال میں سوراج حاصل کرنے کی امید کرنا بہت ہی خوش اعتقادی کا نتیجہ ہے۔ سوراج اتنی آسان چیز نہیں۔ کہ ایک سال یا دس سال میں بھی مل سکے۔ اگر فرض کر لیا جائے۔ کہ سوراج مل بھی گیا ہے۔ تو جب تک اس کو برقرار رکھنے کی طاقت نہ ہو۔ اس کا حاصل ہونا بے فائدہ ہے۔ اور وہ گم شدہ چیز حاصل کس طرح ہو سکتی ہے جو حاصل کی ہوئی سلامت نہیں رہ سکتی۔ اس لئے خیالات کا اس طرف مائل ہونا کہ جب تک سوراج حاصل نہ کر لیں گے۔ تب تک صنعت و حرفت کی طرف توجہ نہیں کریں گے۔ ملک کے لئے مضر ہے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ موجودہ سیاسی حالات کے ماتحت کسی قسم کی صنعتی ترقی ممکن نہیں۔ اور جب سوراج حاصل ہو جائیگا۔ تو سب کچھ فوراً ہو جائیگا۔ یہ لوگ سخت غلطی پر ہیں۔ ان کے خیال کے دونوں حصے غلط ہیں۔ جیسا کہ جمشید ٹاٹا کے فولاد کے کارخانے سے ظاہر ہو چکا ہے۔ اس وقت بھی باہمت لوگوں کے لئے ترقی کے راستے کھلے ہیں۔ اور جو اس وقت کچھ نہیں کر سکتے۔ ان کے

لئے سواراج کے آنے کے بعد بھی راستے بند ہیں۔ دوسرا خیال بھی کہ جب سواراج مل جائیگا۔ تو سب کچھ ایک آن میں ہو جائے گا۔ غلط ہے۔ صنعتی ترقی ایسی چیز نہیں ہے۔ جو بغیر لاکھوں آدمیوں کی متفقہ اور لمبی کوشش کے حاصل ہو سکے۔ جاپان نے تمام دنیا کی اقوام سے کم وقت میں ترقی کی ہے۔ مگر پھر بھی جاپان کی کوشش کو ساٹھ برس ہو گئے ہیں۔ اور ابھی تک بہت چیزوں کا صحیح طور پر بنانا نہیں آتا۔ حالانکہ جاپان میں پرانی صنعت بھی اعلیٰ درجہ کی تھی۔ اور یورپ سے صرف مشینوں کا استعمال سیکھنا پڑا۔ ۱۸۷۱ء میں بھی جب جاپان ابھی یورپ سے بہت نہیں سیکھا تھا۔ پرانی صنعت ایسی تھی۔ کہ جاپانی جلاہوں کو دنیا اور امریکہ کی نمائشوں میں بڑے بڑے انعام ملے۔ ۱۷؎ جب یہ صورت ہے۔ تو صنعت کی طرف سے قوم کا منہ موڑنا ملک کے حق میں مفید نہیں ہو سکتا۔ حقیقی سواراج وہ ہے۔ جس کی بنیاد قوت صنعت پر ہو۔ اس لئے جن لوگوں کو سواراج عزیز ہے۔ ان کا مقدم فرض یہ ہے۔ کہ بہترین مشینری یورپ اور امریکہ سے لا کر ملک میں کارخانے جاری کریں۔ تاکہ ملک تمام ضروری اشیاء کے لئے غیر ممالک سے مستغنی ہو جائے۔ یہ ایسی ضرورت ہے۔ کہ اس کے پورا ہوئے بغیر سواراج کا حصول ممکن نہیں۔ پس اس کے شروع کرنے میں جتنی بھی دیر لگے گی۔ اتنا ہی سواراج کا دن پیچھے پڑ جائے گا۔ حقیقی سواراج وہی ہو گا جو اس وقت ملے۔ جب ملک اس کو سنبھالنے کے لئے تیار ہو۔ اور اس سے پہلے خواہ نام کچھ ہی ہو۔ حقیقت وہی ہو گی۔ جو اب ہے۔ ہم مثال کے طور پر پوچھتے ہیں۔ کیا ایران میں سواراج ہے؟ ہرگز نہیں۔ ایسا ملک جس میں جب طاقتور قومیں چاہیں۔ اپنے

۱۷؎ نئے جاپان کے پچاس سال مرتبہ کونٹ اوکوما ص ۵۶۱

مقاصد کو پورا کرنے کے لیے داخل ہو جائیں۔ اور جس محکمے پر چاہیں ضرورت کے وقت قبضہ کر لیں۔ خود مختار نہیں۔ بلکہ ماتحت ہے۔

ہمارا مقصد یہ نہیں۔ کہ سیاسی کوششوں کو ملتوی کر دیا جائے۔ بلکہ ہمارا یہ مقصد ہے۔ کہ اس قسم کی سیاسی کوششوں کے لئے جن کی کیفیت ہم لکھ چکے ہیں۔ تمام اور تحریکوں کو ملتوی کر دینا سخت غلطی ہے۔ سیاسی کوششیں بھی ہوں۔ مگر اس طرح سے نہیں کہ تمام قومی مال اور قوت انہی میں جذب ہو جائے۔ صنعت کی ترقی ایسی چیز ہے۔ کہ جنگ میں بھی اس کو ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔

اس وقت صنعت کے متعلق لوگوں میں دو متضاد خیال ہیں۔ ایک فریق تو یہ خیال کرتا ہے۔ کہ ملک کی صنعت کو ترقی دینا ہمارا فرض نہیں۔ بلکہ تمام تر یہ فرض گورنمنٹ کا ہے۔ اور جو کچھ گورنمنٹ کرے گی وہ کافی ہوگا۔ دوسرا فریق یہ خیال کرتا ہے۔ کہ گورنمنٹ ہرگز نہیں چاہتی۔ کہ ملک صنعت میں ترقی کرے۔ اس لئے ہماری کوششیں رائگاں جائیں گی۔ دونوں فریق اس نتیجے پر متفق ہیں۔ کہ ہمیں کچھ نہیں کرنا چاہیے۔ دونوں فریق گورنمنٹ پر ملک کے تنزل کا الزام لگانے کیلئے تیار ہیں۔ اور دونو تسلیم نہیں کرتے کہ ملک کے تنزل میں ہماری کوتاہی کو بھی دخل ہے۔ یا ہمارا بھی فرض تھا کہ ہم ملک کی ترقی کیلئے کوشش کرتے۔ اور اگر ہم نے کوشش نہیں کی۔ تو ہم بھی ایسے ہی ملزم ہیں۔ جیسا کہ گورنمنٹ۔ جو یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ جو کچھ گورنمنٹ کرے گی۔ وہ کافی ہوگا۔ ان کو یاد رکھنا چاہیے۔ کہ کسی ملک کی گورنمنٹ بھی ملک کی صنعتوں کو بغیر اہل ملک کی امداد کے ترقی نہیں دے سکتی۔ گورنمنٹ زیادہ سے زیادہ آسانیاں بہم پہنچا سکتی ہے۔ مدد کے طور پر تھوڑا روپیہ دے سکتی ہے۔ مال خرید سکتی ہے۔ مگر کامیابی کا دارومدار کارخانہ داروں کی لیاقت۔ ہمت اور استقلال پر ہوتا ہے۔

اگر اہل ملک غافل اور سست ہوں۔ محنت جانفشانی سے کام نہ کریں لیاقت بہم نہ پہنچائیں۔ جرأت اور استقلال سے کام نہ لیں۔ تو کوئی گورنمنٹ کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ جاپان جرمنی امریکہ اور انگلستان کی ترقی کے حالات پڑھے جائیں۔ تو چند آدمیوں کے نام نظر آئینگے جنہوں نے اپنی حسن تدبیر، محنت۔ استقلال اور جرأت سے نئے کاموں کو کامیابی تک پہنچایا۔ انہی لوگوں کو تمام ترقی کا بانی سمجھنا چاہیئے

اگر گورنمنٹ اپنی طرف سے سکول اور کالج کھول کر لوگوں کو ہنر سکھانے کی کوشش کرے۔ تو کیا گورنمنٹ کے پاس اتنا روپیہ ہے کہ وہ تمام ملک کی ضرورت کو پورا کر سکے۔ اس وقت جبکہ گورنمنٹ کے بجٹ میں خرچ زیادہ ہے۔ اور آمدنی کم ہے۔ کیا امید کی جا سکتی ہے۔ کہ گورنمنٹ اس کام پر کروڑوں روپیہ خرچ کرے گی۞ اور بالفرض اگر گورنمنٹ کچھ کوشش کرے بھی تو کیا وہ کافی ہوگی۔ جب تک اہل ملک اور گورنمنٹ دونوں اس کام کو پورے زور سے اپنی اپنی جگہ نہ کریں گے۔ ترقی کا خواب پورا نہیں ہوگا۔ انڈسٹریل کانفرنس نے اب تک جو کام کیا ہے۔ وہ صرف تجاویز پیش کرنے اور واقفیت بہم پہنچانے کے متعلق کیا ہے۔ مگر ضرورت اس بات کی ہے۔ کہ ایک بڑے نظام کے ماتحت عملی کام کیا جائے۔ جس سے لوگوں کی عملی رہنمائی ہو۔ اگرچہ جرمن گورنمنٹ تمام دنیا کی گورنمنٹوں

۞ ۱۹ اپریل کے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں ہے۔ کہ ممبر صنعت وحرفت نے محکمہ ہائے صنعت کی کانفرنس میں بیان کیا۔ کہ ان کی بڑی صنعتی تجاویز میں روک واقع ہوگئی ہے۔ ان کا خیال تھا۔ کہ کلکتہ میں چمڑا رنگنے اور بوٹ بنانے کا کارخانہ ملک کی رہنمائی کی غرض سے قائم کریں۔ اور ایک کیمیاوی تحقیقات کیلئے مرکزی دارالعلوم بنائیں۔ مگر روپے کی کمی کیوجہ سے یہ تجاویز بغیر تحدید وقت ملتوی کر دی گئی ہیں۔

سے بڑھ کر صنعتی ترقی کی طرف متوجہ ہے۔ مگر اس وجہ سے وہاں کے لوگ اس طرف سے غافل نہیں۔ چنانچہ سیکسنی میں جس کی آبادی کل ۵ء۴ لاکھ ہے۔ تین سو ساٹھ ٹیکنیکل سکول ہیں۔ جو مختلف قسم کے ہنر سکھاتے ہیں۔ اور یہ سب لوگوں کے قائم کردہ ہیں۔

دوسرا فریق جو یہ کہتا ہے۔ کہ گورنمنٹ نہیں چاہتی۔ کہ ملک صنعتی ترقی کرے۔ اور اس لئے گورنمنٹ ایسی کوششوں کو روکے گی۔ یا تو ناواقفیت کی وجہ سے ایسا کہتا ہے۔ اور یا اپنے اوپر سے فرض ٹالنے کیلئے۔ ساتھ ہی یہ لوگ کہتے ہیں۔ کہ گورنمنٹ ہرگز نہیں چاہتی کہ ملک میں اعلیٰ تعلیم ہو۔ مگر کالج اور سکول برابر بناتے چلے جاتے ہیں۔ اگر وہ خود اپنے اس فعل پر ہی غور کریں۔ تو بھی ان پر ثابت ہو گا۔ کہ اگر گورنمنٹ ایک بات کو نہ بھی چاہے۔ تو بھی وہ ہو سکتی ہے مگر گورنمنٹ کے شائع شدہ ارادے سب اس خیال کی تردید کرتے ہیں۔ گورنمنٹ نے جس پالیسی کا اظہار بار بار کیا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ ہندوستان میں صنعتوں کو اتنی ترقی دی جائے۔ کہ ملک محتاجی کی حالت سے نکل جائے۔ چنانچہ ۹ رجون ۱۹۲۱ء کے "پائنیر" میں سر ملکم ہالیڈے کی اسپیچ چھپی ہے جو اس نے تمام صوبجات کے وزراء صنعت و حرفت کو جمع کر کے دی۔ اس میں اس نے اس بات کا اعادہ کیا ہے۔ کہ گورنمنٹ کا یہ منشاء ہے۔ کہ ملک کی صنعتوں کو ہندوستانیوں کے لئے ترقی دی جائے۔ تاکہ ملک اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔ ان الفاظ کے علاوہ جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں۔ گورنمنٹ نے کئی صوبوں میں شکر چمڑے اور ایلومینیم کے کارخانوں کی امداد بھی کی ہے۔ ایسے ہی ٹاٹا کے لوہے کے کارخانے کو چالیس میل ریل بنا کر دی ہے۔ ہر سال ولائت میں صنعتی تعلیم کے لئے۔ ہندوستانی طالب علموں کو بھی بھیجتی ہے۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء تک ایک سو سے زیادہ طالبعلموں کو گورنمنٹ وظیفہ دے چکی ہے۔

اس سے کم از کم اتنا تو ثابت ہوتا ہے۔ کہ اگر اہل ملک بھی اسی قسم کی کوششیں کریں۔ تو گورنمنٹ روک نہیں ڈالے گی۔ مگر ان کاموں کے لئے لمبی محنت اور استقلال درکار ہے۔ یہ وہ سوا راج ہے۔ جو ایک برس میں حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کے لئے برسوں کی محنت شاقہ کی ضرورت ہے۔ مگر غالباً لوگ لمبی انتظار کرنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ ایسے نتائج چاہتے ہیں۔ جو فوراً حاصل ہو جائیں۔

اب ہم ایک مشکل کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ جو صنعتی ترقی کے راستے میں بڑی روک ہے۔ یہ روپے کا فراہم کرنا ہے۔ اگر متوسط الحال لوگ بڑے بڑے کارخانے بنانا چاہیں۔ تو سرمایہ کے لئے سوائے اس کے اور کوئی طریق نہیں۔ کہ کمپنی بنا کر روپیہ جمع کریں۔ مگر یہ ایک معروف بات ہے۔ کہ ایسے کاموں کے لئے اہل ملک روپیہ نہیں دیتے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ لوگوں میں ابھی کارکنوں پر اعتماد نہیں ہوا۔ بلکہ اکثر خیانت کا ڈر رہتا ہے۔ اس کی وجہ ایک تو لوگوں کی نا تجربہ کاری ہے۔ کہ پہلے ایسے کاروبار کے عادی نہیں ہیں۔ اور دوسری کارکنوں کی اخلاقی کمزوری۔ خیانت دو قسم کی ہے۔ ایک تو یہ کہ مشترکہ سرمایہ کو کارکن اپنے اوپر صرف کر کے کارخانے کا دیوالہ نکال دیں۔ اور دوسری یہ کہ کارخانے کا کام مشترکہ کام سمجھ کر ایسی مستعدی اور جانفشانی سے نہ کریں۔ جیسا کہ اپنا ذاتی کام کرتے ہیں۔ اور اس غفلت کی وجہ سے کارخانہ خسارے کی وجہ سے بند ہو جائے۔ یہ دونوں خیانت کی اقسام ہیں۔ اور دونوں کا نتیجہ عدم اعتماد ہے۔ سب سے بڑی ضرورت مشترکہ کاروبار کے لئے اعتماد کا قائم کرنا ہے۔ جب تک کارکن معتمد علیہ نہیں ہوں گے۔ روپیہ فراہم نہیں ہو سکے گا۔

ہر ملک میں ابتدا میں مشترکہ کاموں میں یہ تکلیف پیش آتی ہے۔ انگلستان میں ابتدا میں کمپنیوں کے معاملے میں بہت خیانت ہوتی تھی۔ اور بہت کمپنیاں ٹوٹتی تھیں۔ مگر جب کارکنوں کو تجربہ سے ثابت ہو گیا۔ کہ کاروبار

کی ترقی کے لیئے دیانت داری ضروری شے ہے۔ تو خیانت کم ہو گئی۔ ایسی ابتدائی حالت میں جیسی کہ ہندوستان کی ہے۔ بعض کمپنیوں کی ابتداء گورنمنٹ اپنی ذمہ واری پر کر سکتی ہے۔ یعنی حساب کی پڑتال کی ذمہ وار گورنمنٹ ہوگی۔ یا ملک کی انجمنیں جن پر لوگوں کو اعتماد ہو۔ ذمہ لے سکتی ہیں۔ غرضیکہ وہ لوگ جو عوام سے کاروبار کے لیئے روپیہ لینا چاہیں۔ معتمد علیہ ہونے چاہیں۔ خواہ وہ اپنی ذات میں ایسے ہوں۔ یا گورنمنٹ یا کسی ملکی انجمن کی ذمہ واری پر۔

آخر میں قبل اس کے کہ ہم اس باب کو ختم کریں۔ ہم ایک مغالطہ کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ جو اکثر لوگوں کو لاحق ہوتا ہے۔ وہ یہ خیال ہے۔ کہ گرم ممالک قدرتاً زراعت کی زیادہ اہلیت رکھتے ہیں۔ اس لیئے ان کا صنعتوں کی طرف توجہ کرنا غلطی ہے۔ پھر یہ کہا جائے گا۔ کہ انگلستان نے اگر ترقی کی ہے۔ تو کوئلے کی وجہ سے کی ہے ہندوستان میں اتنا کوئلہ کہاں ہے۔ یہ لوگ ترقی کا تمام دار و مدار قدرتی حالات پر رکھتے ہیں۔ ہم مانتے ہیں۔ کہ ہر ملک قدرتی اسباب کی وجہ سے ایک حد سے زیادہ ترقی نہیں کر سکتا۔ بعض ممالک کو آب و ہوا۔ معدنیات دریاؤں وغیرہ کی وجہ سے بعض قسم کے فوائد حاصل ہیں۔ اور بعض ممالک کو دوسری قسم کے۔ یہ بھی درست ہے۔ کہ بعض ممالک کو بعض ممالک پر فضیلت حاصل ہے۔ مگر ہم یہ نہیں مان سکتے۔ کہ ترقی کی وجہ صرف قدرتی اسباب ہیں۔ قدرتی اسباب سے بھی زیادہ ضروری انسانی علم و ارادہ ہے۔ اگر انگلستان نے ترقی کی ہے۔ تو وہ اس وجہ سے نہیں۔ کہ وہاں معدنیات زیادہ ہیں۔ بلکہ اس لیئے کہ اسٹیم انجن اور کپڑا بننے کی مشینیں پہلے پہل انگلستان ہی میں شروع ہوئیں۔ دوسرے لفظوں میں اس وجہ سے کہ ویٹ اور آرک رائٹ انگلستان میں پیدا ہوئے۔ یا یہ کہ ہالینڈ کے جولاہے سب انگلستان چلے گئے یہی معدنیات ابتدا سے ملک میں موجود تھیں۔ مگر جب تک انسانی

علم وارادہ کمزور رہا۔ ان سے کچھ فائدہ نہ اٹھا سکے۔ امریکہ کے خزائن
صدیوں سے بے کار پڑے ہوئے تھے۔ جب تک اخلاقی قوت یورپ
سے نہ پہنچی۔ ملک جنگلی حالت سے نکل نہ سکا۔ اطالین باغبانوں کے
جانے کی وجہ سے کیلیفورنیا میں جو پہلے جنگل تھا اب اسمیں بہترین میوہ جات
پیدا ہوتے ہیں۔ یہی جرمنی جو اب صنعت و علم میں سب سے آگے
ہے۔ یہی ملک یہی آب و ہوا پچاس سال پہلے بھی تھی۔ مگر جب تک
ارادہ مضبوط نہیں ہوا تھا۔ ملک کی صنعتوں نے ترقی نہیں کی۔
نہ صرف موجودہ اسباب کو استعمال کرنے کیلئے انسانی علم و ارادے
کی ضرورت ہے۔ بلکہ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اسباب موجود ہیں۔
انسانی کوشش کی ضرورت ہے۔ مادی دولت سے پہلے اخلاقی
دولت کی ضرورت ہے۔ ٹاٹا کی باضابطہ تفتیش سے پہلے کس کو معلوم
تھا۔ کہ ہندوستان میں ایسی لوہے کی پہاڑیاں ہیں۔ جو دنیا
کے عجائبات میں سے ہیں۔ ابھی راولپنڈی کے قریب تیل نکلا ہے
جس کا ٹھیکہ ایک انگریزی کمپنی نے لیا ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے
کہ ملک میں کیا اسباب ہیں۔ اس بات کی ضرورت ہے۔ کہ اہل ملک
میں سے جو باہمت اور اہل علم لوگ ہوں۔ وہ تمام ملک کو چھان ماریں
پھر جب تمام ملک کی تفتیش ہو چکے گی۔ تو ہم یہ فیصلہ کرنے کے قابل ہونگے
کہ آیا انگلستان کو زیادہ قدرتی فوائد حاصل ہیں۔ یا ہندوستان کو
ایک اور بات بھی ہے۔ جوں جوں انسان کا علم بڑھتا جاتا ہے۔ قدرتی
اشیاء کے نئے خواص اور نئے استعمال معلوم ہوتے جاتے ہیں۔
اس لئے کسی ایک وقت میں ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس ملک میں قدرتی
دولت دوسرے ملک سے زیادہ ہے۔ وہی چیز جو کل بے کار خیال کی
جاتی تھی۔ آج بے بہا ثابت ہوتی ہے۔ یہی پنجاب کے دریا جو پرانے
زمانے میں سوائے آبپاشی کے اور کسی کام کے لائق نہیں سمجھے
جاتے تھے۔ آج قوت برقی کا بے نظیر خزانہ خیال کئے جاتے ہیں۔

غرضیکہ قدرتی دولت نواتنی کثرت سے ہے۔ کہ اس کی کمی کا خیال ہی نہیں کرنا چاہیئے۔ اب ضرورت باقی ہے۔ نواخلاقی دولت کی ہے۔ جس سے قدرتی دولت دولت بن سکے۔ باقی رہا۔ یہ سوال کہ گرم ممالک صنعت میں ترقی نہیں کرسکتے۔ یہ ایسا فرض ہے۔ جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ ہم گذشتہ زمانوں کی طرف نہیں جاتے۔ کہ ہندوستان میں اس وقت کیا کیا۔ صنعتیں موجود تھیں۔ جن کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ ہم موجودہ وقت کو دیکھتے ہیں۔ کہ جہاں کہیں بھی یورپین طریق کا کارخانہ صحیح علم اور پورے سرمایے کے ساتھ بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ کامیابی ہوئی ہے۔ بڑی ضرورت ایسی چیزوں کی ہے۔ جن سے قوت پیدا کی جا سکے۔ مثلاً کوئلہ۔ بجلی تیل وغیرہ۔ کوئلہ کی کمی ضرور ہے۔ مگر غالباً اس وقت تک جب تک پوری تلاش نہیں کی گئی۔ قوت برقی نکالنے کیلئے دریا بے شمار ہیں۔ تیل بھی موجود ہے۔ اور زیادہ کیلئے تفتیش کی ضرورت ہے۔

ایک فائدہ ہندوستان کو ایسا حاصل ہے۔ کہ یورپ کے تمام ملکوں سے سبقت لیجا سکتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ تمام ایسی اشیاء جن میں بڑی مشینوں سے کام نہیں لیا جاتا۔ اور جن کے بنانے میں انسانی ہاتھ کو زیادہ دخل ہے۔ وہ ہندوستان میں ایسی سستی بن سکتی ہیں۔ کہ یورپ کے کسی ملک میں نہیں بن سکتیں۔ ہندوستانی کاریگر جس کام کے لیئے دو ڈیڑھ روپیہ روزانہ لیتا ہے۔ انگریز کاریگر اسی کام کیلئے ایک پونڈ روز لیتا ہے۔ یہ چیزیں ایسی ہیں جیسے ہاتھ کے سلے ہوئے بوٹ۔ کرکٹ کے گیند۔ ٹوتھ برش۔ کپڑے کے برش پاشپ۔ گھڑیاں وغیرہ۔

غرضیکہ کوئی وجہ نہیں۔ کہ ہندوستان یورپ کے مقابلے میں مایوس ہو۔ جس چیز کی ضرورت ہے۔ وہ قوت ارادی ہے۔

پانچواں باب

عملی تجاویز

ذیل میں ہم چند عملی تجاویز ملک کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں جن سے ملک کی صنعتوں میں ترقی ہوسکتی ہے۔ ہمارا یہ خیال نہیں ہے۔ کہ ان کے علاوہ یا ان سے بہتر اور تجاویز نہیں ہوسکتیں۔ بلکہ ہم ان کو مثال کے طور پر لکھتے ہیں۔ تاکہ اہل الرائے اصحاب کی اس طرف توجہ ہو۔ اور ان تجاویز کو یا ان سے بہتر تجاویز کو عمل میں لانے کی کوئی صورت پیدا ہو۔ صنعت کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ہنر اور سرمایہ۔ ان دو چیزوں کے مہیا کرنے اور ان کا آپس میں میل کرنے سے صنعت میں ترقی ہوسکتی ہے۔ ان چیزوں کے مہیا کرنے کیلئے قومی قوت اور ارادوں کا ایک جگہ پر جمع ہونا ضروری ہے۔ اس لئے سب سے مقدم ضرورت اس بات کی ہے۔ کہ تمام صوبوں میں ترقی صنعت کے لئے انجمنیں بنیں۔ جن میں حتی الوسع ملک کا ہر ذی استطاعت اور غیر ذی استطاعت شخص بحیثیت ممبر شامل ہو۔ اور ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق مگر باقاعدہ چندہ دے۔ یہ ایسا کام ہے۔ جس میں سب لوگ شامل ہوسکتے ہیں۔ خواہ ان کی سیاسی پالیسی کچھ ہو۔ چونکہ یہ کام بڑی قوت اور بڑا سرمایہ چاہتا ہے۔ اس لئے ایک صوبے میں مرکز ایک ہی ہو۔ اور مرکزی انجمن تمام صوبے کی چھوٹی انجمنوں سے انتخاب کرکے بنائی جائے۔

ہر گاؤں میں ایک انجمن ہونی چاہیے۔ جس میں تقریباً تمام اہل دہ شامل ہوں۔ اس انجمن کے تین کام ہونے چاہئیں۔ ایک

مشترک سرمایہ سے بینک بنانا۔ جس کی غرض یہ ہو۔ کہ حسب ضرورت تمام لوگ اسی بینک سے قرضہ لیں۔ اور ساہو کاروں کی زد سے بچے رہیں۔ دوسرا کام یہ ہو۔ کہ مشترک سرمایہ سے ایک دوکان کھولی جائے۔ جس میں گاؤں کی ضرورت کی تمام اشیاء مثلاً کپڑا آہنی سامان۔ مصری۔ جوتے وغیرہ باہر سے منگوا کر بیچے جائیں۔ اور غلہ بجائے ساہو کاروں کو دینے کے اسی دکان کی معرفت بیچا جائے تاکہ زمینداروں کو غلہ کی قیمت اچھی ملے۔ اور جو منافع ہو۔ وہ بھی ان پر تقسیم ہو۔ تیسرا کام یہ ہو۔ کہ لوگوں سے چندہ جمع کرکے مرکزی انجمن میں بھیجا جائے۔ یا مرکزی انجمن کی ہدایات کے ماتحت خرچ کیا جائے۔ جس طرح ہر گاؤں میں ایک انجمن ہو۔ اس طرح بڑے شہروں میں ہر محلے کی ایک انجمن ہو۔ شہروں کی انجمنوں کی دکانیں زمینداروں کی انجمنوں کی دکانوں سے براہ راست غلہ منگوا کر لوگوں کے لئے سستے نرخ پر آٹا مہیا کریں۔ اس طرح سے بہت سا فائدہ جو اب ساہو کاروں کے پاس جاتا ہے۔ خود غریب کسانوں اور صناعوں کے کام آئیگا۔ گاؤں اور محلہ کی انجمن سے منتخب ہو کر تحصیل ضلع یا شہر کی انجمن ہو۔ اس کے بھی تین ہی کام ہوں ان کا بینک بڑے پیمانے پر ہو۔ اور ان کی دکان بھی بڑے پیمانے پر ہو۔ ان کے بینک کا یہ کام ہو۔ کہ دیہاتی بنکوں کو حسب ضرورت روپیہ قرض کے طور پر دے سکیں۔ اور اگر دیہاتی بنک کے پاس فاضلہ ہو۔ تو وہ اس بینک میں منافع پر لگا سکے۔ ان کی دکان کا یہ کام ہو۔ کہ دیہاتی دکانوں کو مصنوعات تجارتی نرخ پر مہیا کرے۔ اور ان سے اپنی ضروریات کے لئے غلہ خرید کرے۔ ان کے بعد صوبے کی مرکزی انجمن ہونی چاہئے۔ مرکزی انجمن کا انتخاب ایک مقررہ میعاد کے لئے ضلع وغیرہ کی انجمنوں سے ہو۔ اس انجمن کے سپرد وہ تمام روپیہ کیا جائے۔ جو تمام چھوٹی انجمنوں نے صنعتی ترقی کے لئے جمع

کیا ہے۔ اس روپے سے اس انجمن کا فرض ہو۔ کہ ہنر سکھانے اور سرمایہ جمع کرنے کا انتظام کرے۔

ایسا ہنر سیکھنے کے لئے جو ملک میں نہیں ہے۔ تین ہی طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ ہنرمند لوگ باہر کے ممالک سے آکر یہاں ہنر سکھائیں۔ دوسرا یہ کہ ملکی لوگ غیر ممالک میں جاکر ہنر سیکھیں۔ اور تیسرا یہ کہ ذہین کاریگر غیر ملکی صنعت کو اپنی کوشش سے نقل کرلیں۔ تینوں طریق سے کامیابی ہوسکتی ہے۔ اور ہر ملک کو تینوں طریقوں پر عمل کرنا چاہیئے۔ سب سے سریع طریقہ یہ ہے۔ کہ غیر ممالک کے ہنرمند لوگوں کو معقول معاوضہ دے کر لایا جائے۔ اور وہ ملک کے نوجوانوں کو ہنر سکھائیں۔ اس غرض کے لئے کالج قائم کرنے پڑیں گے۔ جن کا نام مکینکل کالج رکھا جاتا ہے۔ یہ اسی صورت میں مفید ہوں گے۔ جب ان میں وہ ہنر سکھائے جائیں۔ جو عام طور پر ملک کے کاریگر نہیں جانتے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے۔ کہ اپنے ملک کے لوگ غیر ممالک میں جاکر سیکھیں۔ یہ اسی صورت میں زیادہ مفید ہوسکتا ہے۔ جب سیکھنے والے اس ملک سے پورے ماہر ہوکر جائیں۔ یعنی جو کچھ اس ملک میں اس فن کے متعلق سیکھ سکتے ہیں۔ وہ سیکھ کر جائیں۔ اور اس بات پر انحصار نہ رکھیں۔ کہ سکول کے بچوں کی طرح کوئی ان کو پیار سے بٹھا کر سب باتیں سکھا دے گا۔ بلکہ خواہ کالج ہو یا کارخانہ۔ خواہ انہیں ادنیٰ ملازمت ملے یا اعلیٰ یہ اپنے مقصود پر نظر رکھیں۔ اور جس راز کے معلوم کرنے کے لئے گئے ہیں۔ اس کو معلوم کرکے آئیں تیسری تدبیر بھی کارگر ہوسکتی ہے۔ بہت سی چیزیں ہیں۔ جن کے لئے صرف یورپین مشینوں کا استعمال کافی ہے۔ اور ہوشیار کاریگر ان کے استعمال کو بغیر استاد کے سیکھ سکتے ہیں۔ بین مثال ہمارے سامنے سیالکوٹ کے سپورٹس کے سامان ہیں۔ جو بغیر سیکھنے کے ایسی خوبی سے بننے لگے ہیں۔ کہ انگلستان میں کثرت سے جاکر بکتے ہیں۔ ایسی

ہی اور بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں۔ جو ملک کے کاریگر اگر چاہیں تو بغیر سیکھنے کے بنا سکتے ہیں۔ ان تینوں طریقوں کے لئے انجمن کو تین قسم کے انتظام کرنے پڑیں گے۔ پہلی قسم کے لئے ایک بڑا مرکزی کالج قائم کرنا پڑے گا۔ جس میں وہ تمام ہنر چھوٹے کارخانوں میں عملی طور پر سکھائے جا سکتے ہیں۔ سکھائے جائیں گے۔ بڑے کالج کے علاوہ حسب وسعت سرمایہ ملک بھر میں اسی کے نمونے پر ایک ایک دو دو فن سکھانے کے لئے چھوٹے سکول قائم کئے جا سکتے ہیں۔ اگر سیکسنی کا نمونہ لیا جائے۔ تو پنتالیس لاکھ کی آبادی کے لئے تین سو ساٹھ سکول چاہئیں۔ ان سکولوں کے قائم کرنیکا یہ فائدہ ہوگا کہ ایک یورپین کاریگر اس ملک میں رہ کر اتنے خرچ پر سینکڑوں آدمیوں کو سکھا جائیگا۔ جتنا خرچ ایک یا دو طالبعلموں کو یورپ بھیجنے پر ہوگا

ہاں جو کام بغیر اس ملک میں جانے کے نہ سیکھا جا سکے۔ یا جس کے سکھانے کیلئے اس ملک میں کاریگر آنا پسند نہ کریں۔ اس کیلئے ایسے لوگوں کو وظائف دے کر یورپ یا امریکہ بھیجنا چاہیئے۔ جو پہلے اس ملک میں اس کام میں جتنی مہارت ممکن ہے۔ حاصل کر چکے ہوں۔ نئے کورے طالبعلموں پر قومی روپے کو خرچ کرنا اکثر صورتوں میں بے فائدہ ہوگا۔

تیسرے طریق کے لئے ان انجمنوں کا فرض ہوگا۔ کہ مروجہ کاموں کے احسن طور پر بنانے کے لئے یورپین آلات منگوا کر تجربہ کریں۔ اور ملک کے کاریگروں میں ان کو رواج دیں۔

ہنر سکھانے کے بعد انجمن کا فرض ہوگا۔ کہ ایسے لوگوں کے لئے سرمایہ کا انتظام کرے۔ جو اس کے کالجوں سے تعلیم پا کر نکلے ہیں۔ تاکہ وہ چھوٹے چھوٹے کارخانے بنا کر اشیاء تیار کر سکیں۔ اس غرض کے لئے انجمن کا اپنا روپیہ جو چندہ سے جمع کیا ہوا ہوگا۔ کافی نہیں ہو سکتا کیونکہ ان کالجوں اور سکولوں کا خرچ خود بہت زیادہ ہوگا۔ اس لئے ضرورت ہوگی کہ انجمن اپنے رسوخ سے ایک مرکزی صنعتی بنک -

قائم کرے۔ جس کی شاخیں صوبہ کے تمام بڑے بڑے شہروں میں ہوں۔ ان بینکوں کی یہ غرض ہو۔ کہ ملک کی صنعتوں کو ترقی دینے کے لئے معتبر کاریگروں کو انجمنوں کی سفارش پر قرض دے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے۔ کہ کاریگر کو روپیہ نہیں ملتا۔ اس لئے وہ کام نہیں کر سکتا یا اگر ملتا ہے۔ تو شرح سود اتنی زیادہ ہوتی ہے۔ کہ اسے کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ کام چھوڑ دیتا ہے۔ ساہوکاروں کا زیادہ سود لینے میں یہ عذر ہوتا ہے۔ کہ کئی مرتبہ روپیہ وصول نہیں ہوتا۔ ان مشکلات کا حل یہ بینک کر سکیں گے۔ اور چونکہ یہ انجمنوں کی سفارش پر دیں گے۔ ان کے لئے وصول کرنا بھی آسان ہوگا۔ اس مرکزی صنعتی بینک کا سرمایہ انجمن کی سرپرستی میں حصہ داری کے اصول پر جمع کیا جائے۔ اور اس کا انتظام بھی علیحدہ ہو۔ اور اپنے نفع و نقصان کا یہ خود ذمہ وار ہو۔ البتہ اس کے کام اور حساب کتاب کی نگرانی کا ذمہ انجمن لے۔ تاکہ عوام میں بینک کا اعتبار قائم ہو جائے اس بینک کے قائم کرنے میں بڑی امداد اس بات سے ملے گی۔ کہ انجمن کا سرمایہ جو کالجوں یا وظائف وغیرہ کے لئے جمع ہوا ہے۔ وہ اس میں بطور امانت جمع رہے گا۔ مثال کے طور پر اگر مسلم یونیورسٹی والے اپنی سرپرستی میں کوئی بینک کھولنا چاہیں۔ تو ایک تو ان کے نام کی وجہ سے ایسے بینک کے حصے فوراً بک جائیں گے۔ اور دوسرے بینک کو ابتدا ہی میں تیس لاکھ روپے کی امانت مل جائے گی جس سے اس کام کو بہت تقویت ہوگی۔

صنعتی بینکوں کا انتظام زراعتی بینکوں سے جدا ہوگا۔ مگر چونکہ دونوں قسم کے بینک انجمن کے زیر اثر ہوں گے۔ بوقت ضرورت ایک دوسرے کو امداد دے سکتے ہیں۔

انجمن کا یہ بھی فرض ہوگا۔ کہ ایسے کاموں کے لئے جو کالجوں میں چھوٹے پیمانے پر سکھائے نہیں جا سکتے۔ بڑے بڑے کارخانے قائم کر کے انتظام کرے

مثلاً کپڑا بننے یا بائیسکل اور موٹر کار بنانے کے کارخانے۔ اس قسم کے کارخانوں کے بنانے کیلئے جس قدر ابتدائی تحقیقات کی ضرورت ہوگی۔ وہ انجمن کے ماتحت قومی سرمایے سے ہوگی۔ اور جب اس کام میں کامیابی کا یقین ہوجائے۔ تو پھر انجمن کی سرپرستی میں کمپنی بنائی جائے۔ اور لوگوں سے حصہ داری کے طریق پر روپیہ جمع کرکے کام چلایا جائے۔ انجمن کا کارخانے میں صرف اتنا تعلق رہے۔ جتنے حصے انجمن نے ابتدائی اخراجات کے عوض میں خریدے ہیں۔ اس کی غرض یہ ہے کہ انجمن کا وجود اور سرمایہ محفوظ رہے۔ کارخانوں میں خسارے کا ہمیشہ خطرہ رہتا ہے۔ پس کسی ایک کارخانے کے ناکام ہوکر ٹوٹ جانے سے انجمن کو زیادہ مالی نقصان نہ پہنچے۔ اگر انجمن ہر کارخانے کو اپنے سرمایے سے چلائے۔ تو اوّل تو اتنا سرمایہ انجمن کے پاس نہیں ہوگا۔ اور جو ہوگا۔ وہ ایک ہی ناکامی میں تلف ہو جائیگا۔ اس لیئے انجمن کے وجود کی خاص حفاظت ہونی چاہیئے۔ تاکہ صنعتی کوشش ہمیشہ جاری رہے۔ البتہ ان کارخانوں کی نگرانی کی ذمہ دار انجمن ہوگی۔ اور لوگوں میں اعتماد پیدا کرنے کا ذریعہ بھی انجمن ہی ہوگی۔ بینک بنانا اور کمپنی بنانا یہ دو طریقے ہیں۔ جن سے انجمن صنعتوں کے لئے سرمایہ جمع کرسکیگی۔

یہ انجمن اپنے سرمایے کی وسعت کے لحاظ سے صنعت و زراعت کی تمام یا بعض ضروری شاخوں کا انتظام اپنی ملکی ضروریات کے لحاظ سے کرسکتی ہے۔ اور اگر گنجائش ہو۔ تو ملک کی معدنیات کی تفتیش کا کام بھی اپنے ذمہ لے سکتی ہے۔ اسی طرح ضلع کی اشتراکی دکانوں کے سلسلہ کی تکمیل کے لئے مرکزی انجمن بھی ایک بڑی دکان کا اہتمام کرسکتی ہے۔ جو براہ راست دوسرے ممالک سے مال منگوا تمام چھوٹی اشتراکی دکانوں میں تقسیم کرے۔ اور دیہات سے غلہ یا دوسری پیداوار منگوا کر براہ راست غیر ممالک کو بھیجے۔

ان کاموں میں کامیابی کا انحصار لائق اور محنتی آدمیوں کے ملنے پر ہوگا۔ اس لئے ضروری نہیں۔ کہ ہر صوبے کی انجمن اس پروگرام کے ہر حصے پر عمل کرے۔ بلکہ بہتر بھی ہوگا۔ کہ جس کام کے ماہر کارکن مل جائیں۔ صرف اسی پر اکتفا کی جائے۔ سب سے ضروری کام صنعتی کالجوں کا قائم کرنا ہے۔ اس کے بعد صنعتی بنک کا بنانا۔

صوبے سے مراد ہماری ہر جگہ سرکاری تقسیم سے نہیں۔ بلکہ جتنا علاقہ اپنے آپ کو اس قابل سمجھے۔ کہ وہ تمام قسم کے کام اپنے سرمایہ سے کر سکے گا۔ وہ ایک علیحدہ مرکز خیال کیا جائے۔ اس طرح سے بعض سرکاری صوبوں میں دو تین یا چار صنعتی مرکز ہو سکتے ہیں صنعتی کالجوں کا سرمایہ جمع کرنے کیلئے یہ ضروری ہوگا۔ کہ اپنے صوبے کے اندر ہی سے چندہ لیں۔ مگر کمپنی کے حصے بیچنے پر قید مضر ہوگی۔

ان انجمنوں کو سیاسی معاملات سے قطعاً پرہیز کرنا چاہئے۔ ایک تو اس لئے کہ جب تک ایک کام کو پوری توجہ سے نہ کیا جائے۔ اس میں کامیابی نہیں ہوتی۔ اگر یہ سیاسیات میں شریک ہونے لگیں تو ان کے پاس اپنے کام کے لئے نہ قوت رہیگی۔ اور نہ وقت۔ دوسری وجہ یہ ہے۔ کہ صنعتی کامیابی کے لئے ضروری ہے۔ کہ کام جاری رہے اور وقفہ نہ ہو۔ جس عمارت کو یہ شروع کریں گی۔ جب تک اس کو انتہا تک نہ پہنچالیں۔ ان پر کسی ایک مصیبت کا آنا بھی تمام کام کو جڑ سے اکھاڑ دے گا۔ مگر سیاسی کاموں میں آفات کا نازل ہونا معمولی بات ہے۔ اس لئے سیاسی انجمنیں بنتی اور ٹوٹتی رہتی ہیں۔ اور ان کے حصول مقصد میں فرق نہیں آتا۔

چھٹا باب

قومی ترقی کیلئے کن اخلاق کی ضرورت ہے

انیسویں صدی سے پہلے جب سے اقوام یورپ نے صنعت میں ترقی کی ہے۔ ضعیف و قوی اقوام کے درمیان امتیاز قائم کرنے والی چیز یعنی قوی اقوام کی قوت کا راز اور ضعیف اقوام کے ضعف کا سبب صرف چند اخلاقی صفات ہوتی تھیں۔ اب بھی وہ صفات ویسی ہی موثر ہیں۔ جیسے پہلے تھیں۔ مگر اب اکیلی اخلاقی صفات کے ساتھ مادی اسباب کی ایسی ضرورت ہے۔ جیسی پہلے زمانے میں نہیں تھی۔ اس لئے ہم نے مادی اسباب کا ذکر مقدم رکھا ہے۔ نہ اس لئے کہ وہ اخلاق سے ضرورت میں مقدم ہیں۔ بلکہ اس خیال سے کہ ان اقوام کے سامنے جنہوں نے گذشتہ زمانوں میں بغیر مادی اسباب کے محض اخلاقی صفات کے زور پر ترقی کی تھی۔ اور جو اب بھی مادی اسباب اہمیت کو کما حقہ، نہیں سمجھتیں۔ ان ذرائع کی اہمیت ثابت کی جائے۔ اکثر اقوام جو ایک مرتبہ ترقی کے زینے پر پہنچ کر نیچے گر جاتی ہیں۔ اور دوبارہ ابھرنا چاہتی ہیں۔ اور جن کے دلوں میں اپنے بزرگوں کی عظمت کا تکبر بھی ہوتا ہے۔ وہ بجائے موجودہ ترقی یافتہ اقوام کی روش کا مطالعہ کر کے ان کی اقتدا کرنے کے محض اپنے بزرگوں کی اقتدا کو کافی سمجھتی ہیں۔ یہ بات اس صورت میں بہت مضر ثابت ہوتی ہے۔ جب زمانے کے حالات ایسے بدل گئے ہوں۔ کہ جو زادراہ ان کے بزرگوں کے لئے کافی تھی۔ اب بالکل ناکافی ہو۔ اس لئے ہم نے اخلاق کا ذکر مادی اسباب کے بعد کیا ہے۔ کیونکہ یہ وہ چیز ہے۔ جو قدیم زمانوں سے

چلی آتی ہے۔ اور جس کی طرف متوجہ کرنے کے لئے ہر قوم کے پاس جس نے کبھی ترقی کے راستے پر قدم مارا ہے۔ اپنے بزرگوں کی مثالیں موجود ہیں۔ اگرچہ ان اخلاق کی ظاہرا شکل میں بھی زمانے کی روش کے ساتھ کچھ تبدیلی ہو گئی ہے۔ مگر حقیقت نہیں بدلی۔ ہم اس وقت صرف ایک خلق کا ذکر کریں گے۔ جس کو خلق عظیم کہنا چاہئے۔ اور جو اس وقت یورپین اقوام میں ہے۔ مگر ایشیائی اقوام میں عموماً نہیں پایا جاتا۔ الا ماشاء اللہ۔ ہمارا مقصد یہ ہے۔ کہ جیسے یورپ میں بہت سے علوم تھے۔ جو ہم اپنی بہتری کے لئے سیکھ سکتے تھے۔ ایسے ہی ان میں بعض اخلاق تھے۔ جو ہم میں نہیں تھے۔ مگر ہماری بہتری کے لئے ان کا سیکھنا ضروری تھا۔ اور اب بھی ہے۔ ہمارا مطلب ان اخلاقی صفات سے ہے۔ جن کی وجہ سے بعض لوگ کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مل کر کام سکتے ہیں۔ اور بعض نہیں کر سکتے۔ غالباً بعض اصحاب کہیں گے۔ کہ یہ تو آسان بات ہے۔ کہ انسان بجائے اکیلے اکیلے کام کرنے کے مل کر کام کریں۔ مگر یہ آسان نہیں۔ ملکر کام کرنے کے لئے بہت سی صفات کی ضرورت ہے۔ جن کا پیدا ہونا آسان نہیں بلکہ بعض اوقات ممکن بھی نہیں ہوتا۔ اور بغیر ان صفات کے کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔

سب سے پہلی ضرورت یہ ہے۔ کہ ایک غرض مشترک ہو۔ جو تمام ذاتی اغراض پر غالب ہو۔ ہر شخص غرض مشترک کو اپنی تمام ذاتی اغراض اور خواہشات پر مقدم رکھے۔ اگرچہ غرض مشترک انتہا کار ہر شخص کے لئے اس کی ذاتی اغراض سے بھی زیادہ نفع بخش ہوتی ہے۔ مگر ابتدا میں اس کا ذاتی اغراض پر مقدم کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ ذاتی اغراض کو ترجیح دینے سے ایسی مذموم باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ جیسے خیانت یا بے انصافی جو ایک انسان کو دوسرے انسان کا دشمن بنا دیتی ہیں۔ انسان

مل کر بھی کام کر سکتے ہیں۔ جب ان میں سے ہر ایک یا اکثر کے دل میں غرض مشترک کی ایسی محبت ہو۔ کہ تمام باتیں جو اس کے حصول میں سدراہ ہوں۔ قربان کر دی جائیں۔ ہم نے اس اصول کو موجودہ زمانے کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ مگر یہ اصول ہر زمانے کی کامیاب قوموں میں موجود تھا۔ اس لئے مختلف قوموں نے اس کو مختلف الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ مذہب اسلام میں جو یہ اصول ہے۔ کہ خدا کی محبت غیر اللہ کی محبت پر غالب ہونی چاہیئے۔ اس کا بھی یہی مقصد ہے۔ اب سوال یہ ہے۔ کہ غرض مشترک کیا ہو۔ کیا مذہب ہو۔ ملک ہو۔ صنعت ہو۔ تجارت ہو۔ علم ہو۔ یا ان سب کے علاوہ کچھ اور ہو۔ ہمارے نزدیک جب لوگوں کی یہ حالت ہو۔ کہ وہ مل کر کام کرنے کے لائق نہیں۔ تو سب سے پہلے ضرورت اس امر کی ہے۔ کہ وہ ایسی تربیت حاصل کریں جس سے ان میں یہ قابلیت پیدا ہو۔ اس تربیت کے لئے غرض مشترک خواہ کوئی ہو۔ ایک ہی جیسا فائدہ ہو سکتا ہے۔ جو بھی غرض قرار دی جائے۔ وہ سب دوسری چیزوں سے قولاً اور عملاً عزیز ہو۔ تمام کوششیں اسی کے لئے ہوں۔ ناتربیت یافتہ لوگوں کے لئے اس امر کا سمجھنا بھی مشکل ہے۔ کہ کوئی انسان کسی امر میں اکیلا اپنی کوشش سے ایک حد سے آگے ترقی نہیں کر سکتا۔ اور اگر یہ خواہش ہو۔ کہ اس حد سے تجاوز کرے۔ تو دوسروں کی اعانت اور ان سے استعانت کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اگر حقیقت کو دیکھا جائے۔ اور ظاہر پر انحصار نہ رکھا جائے۔ تو منتظم قوموں کا ادنیٰ سے ادنیٰ فرد غیر منتظم قوموں کے معزز ترین فرد سے معزز ہے۔ وجہ یہ ہے۔ کہ منتظم قوموں کے ہر فرد میں تمام قوم کی قوت موجود ہے۔ اور غیر منتظم اقوام کے افراد میں سوائے اپنے ہاتھ پاؤں کے اور کوئی قوت نہیں۔ فرض کریں۔ کہ ایک

طرف ایک سو منتظم آدمی ہیں. جو مل کر کام کرتے ہیں۔ اور جن کی غرض ایک ہے۔ اور ان کے مقابلے میں ایک لاکھ آدمی ہیں۔ جن کی اغراض مختلف ہیں۔ اب اگر یہ آپس میں مقابلہ کریں۔ تو یقیناً سو آدمی لاکھ پر غالب آ جائیں گے۔ یہ وجہ نہیں۔ کہ ان ایک سو آدمیوں میں کوئی معجزانہ قوت پیدا ہو گئی ہے۔ بلکہ صرف یہ وجہ ہے۔ کہ چونکہ ان کی غرض ایک ہے۔ وہ سو ہیں۔ اور ان کے مقابلے میں جو ایک لاکھ کی تعداد ہے۔ چونکہ ان میں سے ہر ایک کی غرض صرف اپنی ذات سے متعلق ہے۔ اس لئے وہ لاکھ نہیں۔ بلکہ ایک آدمی کے برابر ہیں۔ اب ظاہر ہے۔ کہ جب سو آدمی کا ایک آدمی سے مقابلہ ہو گا۔ تو سو ایک پر غالب آ جائینگے۔ خواہ یہ مقابلہ ایک لاکھ مرتبہ ہو۔ نتیجہ یہی ہو گا۔ پس اس صورت میں سو آدمی کا مقابلہ ایک لاکھ سے نہیں۔ بلکہ سو آدمی کا مقابلہ ایک آدمی سے ہے۔ ہاں یہ مقابلہ ایک لاکھ مرتبہ ہوا ہے۔ نہ صرف اس ایک سو آدمی کی قوت ایک سو کے برابر ہو گی۔ بلکہ ان میں سے ہر ایک کی قوت بہت حالات میں اتنا کام دے گی۔ جتنا سو کی مجموعی قوت دے سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ منتظم اقوام کے افراد خطرناک ممالک میں بڑی دلیری سے سفر کر سکتے ہیں۔ اور کوئی ان کو ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس ایک آدمی کو ہاتھ لگانا تمام قوم پر حملہ کرنے کے برابر ہے۔ برخلاف اس کے غیر منتظم اقوام کے افراد کی ایسے ممالک میں جانے سے روح کانپتی ہے۔ اور اگر وہ جائیں بھی تو خواہ ذاتی طور پر وہ کیسے ہی مشہور ہوں۔ کوئی ان کی اتنی بھی پرواہ نہیں کرے گا۔ جتنی ایک جنگلی جانور کی۔ اس موقع پر ایک انگریز کا واقعہ قابل ذکر ہے۔ جو بھیس بدل کر حج کر رہا تھا۔ راستے میں جب اونٹ والے نے اس کو اور اس کے ہمراہیوں کو بہت تنگ کیا۔ اور گستاخی

سے پیش آیا۔ تو انگریز نے غصّے میں یہ ارادہ ظاہر کیا۔ کہ میں اس کو پستول سے مار دوں گا۔ جب اس کے رفقاء کو معلوم ہوا۔ تو انہوں نے اس کو سمجھایا۔ کہ اگر تو اس بدوی کو مار دے گا۔ تو اس کی تمام قوم اس کا بدلہ لینے کے لئے آجائیگی۔ اور نہ صرف تجھے ماردیں گے بلکہ تمام قافلے کو لوٹ لیں گے۔ اور حاجیوں کو بلا امتیاز تہ تیغ کر دیں گے۔ اس ایک بدوی کی قوت اس کی تمام قوم کی قوت کے برابر تھی۔ ایسے ہی اس انگریز کو ایسے خطرناک حالات میں باوجود شدید ممانعت کے بھیس بدل کر جانے کی جرأت اس لئے ہوئی کہ اس نے خیال کیا ہوگا۔ کہ اگر میرا بھید کھل گیا۔ تو میرے لئے محفوظ ترین طریق یہ ہوگا۔ کہ میں اپنے آپ کو کسی ترکی افسر کے حوالہ کر دوں۔ اور وہ میرے ساتھ وہ سلوک کرنے پر مجبور ہوگا۔ جو میری قوم کی قوت اور شان کے لائق ہے۔

غرض مشترک کی قدر و قیمت و حمیت دلوں میں قائم ہونے کے ساتھ ہی ایک اور صفت کی ضرورت ہے۔ اور وہ صفت اطاعت ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ کہ یورپین اقوام حریت پسند ہیں۔ اور ایشائی اقوام غلامی پسند۔ مگر یورپین اقوام کا اگر امتیازی نشان دیکھا جائے۔ تو وہ اطاعت ہے۔ اور اگر ایشائی لوگوں کی طرف غور کیا جائے۔ تو ان میں سرکشی اور خودی کا مادہ زیادہ ہے۔ خواہ لوگوں میں غرض مشترک کی محبت کس قدر مضبوط ہو۔ جب تک وہ سب مل کر ایک راستے پر نہیں چلیں گے۔ تب تک ان کی قوتیں جمع ہو کر ایک قوت نہیں بن سکتیں۔ ایک راستے پر مل کر چلنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ ہر ایک کے دل میں ایک ہی خیال ہو۔ جس کے حکم سے اس کے اعضا حرکت کریں۔ مگر ہر ایک کے دل میں ایک خیال کا ہونا محالات میں سے ہے۔ اگر مختلف اشخاص ایک ہی مقصد کو دل میں

رکھ کر اس کے لئے کوشش کریں۔ تو ان کی تدابیر بھی جدا ہونگی۔ اور کوششیں بھی الگ قسم کی ہوں گی۔ پس اگر یہ ضرورت ہو۔ کہ تمام شخص ایک ہی طریق پر کوشش کریں۔ اور سب کی قوت ایک نقطے پر خرچ ہو۔ تو لازم ہے۔ کہ وہ سب ایک حکم کے نیچے ہوں۔ قدیم زمانے میں بادشاہ یا مذہبی پیشوا کا حکم نافذ ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے لوگ متحد رہتے تھے۔ مگر زمانے نے تجربے سے یہ سمجھ لیا ہے۔ کہ اصل غرض اتحاد ہے۔ اس کے لئے ضروری نہیں۔ کہ ایک خاندان کی نسلاً بعد نسل بے چون وچرا اطاعت کی جائے۔ ملکر کام کرنے کیلئے اطاعت ضروری ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں۔ کہ وہ ایک خاص ممتاز خاندان کی ہو۔ بجائے کسی ممتاز خاندانی بادشاہ یا سردار کے اس زمانے میں یہ زیادہ مناسب سمجھا گیا ہے۔ کہ جو فریق تعداد میں غالب ہو۔ باقی لوگ اس کی اطاعت کریں۔ اور ساتھ ہی اس اطاعت کے دائرے کو محدود اور مضبوط کر دیا گیا ہے۔ یعنی جن باتوں میں اجتماع اور اطاعت کی ضرورت ہے ان کی تعداد کم کردی گئی ہے۔ مگر ان میں ایسی کامل اطاعت ہوتی ہے کہ پہلے کسی زمانے میں ممکن نہیں تھی۔ پہلے زمانے میں شاید یہ خیال ہو کہ جب تک ہر شخص بادشاہ وقت کا ہر بات میں پورا مطیع نہ ہو۔ اس وقت تک قومی اتحاد قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لئے حکومت اپنا فرض سمجھتی تھی۔ کہ نہ صرف بغاوت کے لئے لوگوں کو سزا دے۔ بلکہ علمی اور مذہبی خیالات میں بھی ان سے فرمانبرداری کی توقع کی جاتی تھی۔ اور اگر وہ نہ کرتے تھے۔ تو ان کو سزا دی جاتی تھی۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ صرف ان امور کے حصول کے لئے اطاعت مفید ہے۔ جو بغیر قوت کے اجتماع کے حاصل نہیں ہو سکتے۔ باقی علمی اور مذہبی امور ایسے ہیں۔ کہ ان میں عقول کا اجتماع نہ ممکن ہے۔ اور نہ مفید۔ جسمانی قوتوں کا اجتماع ممکن ہے۔ اور اس اجتماع

سے قوت زیادہ ہو جاتی ہے۔ جیسے وزن جمع کرنے سے کل وزن بڑھ جاتا ہے۔ مگر عقول میں یہ درست نہیں۔ ایک عقل میں اتنی قوت ہو سکتی ہے۔ کہ تمام دنیا کی عقلوں کے مجموعے سے بڑھ کر ہو۔ جسمانی زور اور وزن ایک قسم کی کیفیت رکھتے ہیں۔ دونوں جمع ہو سکتے ہیں ایک پتھر جس کو ایک آدمی نہیں ہلا سکتا۔ اس کو دس مل کر ہلا سکتے ہیں۔ مگر عقول کا اجتماع نہیں ہو سکتا۔ عقل کی تشبیہ نظر کے ساتھ صحیح ہے۔ اگر ایک آدمی کی نظر دس میل تک پہنچ سکتی ہے۔ اور باقی معمولی انسانوں کی نظر پانچ میل سے آگے کام نہیں کر سکتی تو دو آدمی مل کر یہ نہیں کہہ سکتے۔ کہ ہماری نظر اس کے برابر ہو گئی ہے۔ اور چونکہ ہم میں سے ہر ایک پانچ میل تک دیکھ سکتا ہے۔ اس لئے ہم دونوں مل کر اسی مقام پر کھڑے ہو کر دس میل تک دیکھ سکیں گے۔ نظریں تو دونوں پانچ پانچ میل کے فاصلے پر کھڑے ہو کر دس میل کی کیفیت معلوم کر سکتے ہیں۔ مگر عقل میں یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر ایک آدمی کی عقل دوسرے آدمیوں سے دور یا گہری جاتی ہے۔ تو تمام دنیا مل کر بھی ان حقائق کو دریافت نہیں کر سکتی۔ جن کو وہ اکیلا کر سکتا ہے۔ اس لئے عقلی اور عملی معاملات میں اطاعت چاہنا انسانی ترقی کے لئے بے حد مضر ہے۔ اطاعت صرف انہی چیزوں تک محدود رہنی چاہیئے۔ جو انسان کی مالی اور جانی بہتری کے لئے ضروری ہیں۔ یا ان عقلی اور اخلاقی امور میں جن پر سب لوگ بلا استثناء متفق ہیں۔ یورپ کی قوت کا ایک راز مالی اسباب کے ماتحت بیان کر چکے ہیں۔ اور دوسرا راز اہل یورپ میں اطاعت کا مادہ ہے۔ اطاعت کا پہلا درجہ کثرت رائے کی اطاعت ہے۔ اور دوسرا اپنے افسروں کی اطاعت ہے۔ اور ایسی اطاعت شاید ہی کسی زمانہ میں اسکی نظیر ملتی ہو۔ جیسے ان کاموں کی تعداد کم ہو گئی ہے۔ جن میں اطاعت واجب ہے۔ ایسے ہی اس

اطاعت کی نوعیت بدل گئی ہے۔ اور قوت بڑھ گئی ہے۔ پہلے زمانے
کی اطاعت مجبوری کی اطاعت تھی۔ مگر یہ اطاعت خوشی کی اطاعت
ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ یورپ نے پچھلے سو برس میں آزادی
میں ترقی کی ہے۔ مگر وہ اطاعت کے اصول سے منحرف نہیں ہوئے
بلکہ ان کی آزادی دو قسم کی ہے۔ ایک آزادی تو یہ ہے۔ کہ بجائے
خاندانی سرداروں اور بادشاہوں کی اطاعت کرنے کے یہ اختیار
حاصل کیا ہے۔ کہ اپنے مطاع خود منتخب کریں۔ تاکہ جیسا ایک رنگ
میں وہ ہمارا محتاج ہوگا۔ ایسے ہی دوسرے رنگ میں ہم اس کے
ماتحت ہوں گے۔ جیسے اس کو ہماری خواہشات کی اطاعت کرنی
پڑے گی۔ ویسے ہی ہم کو اس کے تفصیلی احکام کی اطاعت کرنے
کی ضرورت ہوگی۔ جو ان خواہشات کے حاصل کرنے کیلئے ضروری
ہیں۔ گویا دونوں ایک رنگ میں مطاع ہوں گے۔ اور دوسرے
میں مطیع۔ دوسری آزادی یہ ہے۔ کہ مذہبی علمی خیالات میں
کوئی شخص کسی دوسرے کے ساتھ اتفاق کرنے یا اس کا کہنا ماننے
پر مجبور نہیں۔ عقلی اور عملی امور میں بھی اگرچہ قانوناً آزادی ہے۔ اور
کوئی شخص مجاز نہیں۔ کہ کسی دوسرے کو مجبور کر کے اس کے خیالات
کو تبدیل کرے۔ مگر منتظم قوم ہونے کا یہ اثر ہے۔ کہ جیسے جب
وزیر ضرورت ظاہر کرتا ہے۔ کہ لڑائی کے لئے آدمیوں کی ضرورت
ہے۔ تو لاکھوں آدمی بغیر مجبوری کے اپنی رضامندی سے چلے
آتے ہیں۔ ایسے ہی جب مقتدر اور بارسوخ لوگ کسی مسئلہ پہ
کچھ لکھ دیتے ہیں۔ تو ہر شخص کی زبان پر ان کے الفاظ اور ہر
شخص کے دل میں وہی خیالات ہوتے ہیں۔ لباس کا یہ حال
ہے۔ کہ جیسا لباس رہنمایان فیشن پسند کریں۔ ہر شخص وہی
لباس پہنتا ہے۔ اگر یورپ کے کسی شہر میں دیکھا جائے۔ تو
تمام لوگ قریباً ایک ہی قطع اور مرد قریباً ایک ہی رنگ کا

لباس پہنے ہوتے ہیں۔ عورتیں بھی ان اقسام سے باہر نہیں جا سکتیں۔ جو فیشن میں داخل ہیں۔ اگر اونچے گون کی رسم ہوتی ہے۔ تو جدھر دیکھتے ہیں۔ گون پنڈلیوں تک یا قریباً گھٹنوں تک نظر آتے ہیں۔ اگر آستینیں چھوٹی رکھنے کا فیشن ہے۔ تو ہر لیڈی کے بازو ننگے نظر آتے ہیں۔ اگر سینہ ننگا رکھنے کی رسم ہے تو خواہ سردی سے بیمار ہو جائیں۔ مگر سینہ فیشن کے مطابق ننگا ہے۔ غالباً فی نفسہ یہ باتیں قابل تضحیک ہوں۔ مگر یہ ایک قوم کی یگانگت اور اطاعت کی علامات ہیں۔ جب پہنتے ہیں۔ تو سب ایک لباس پہنتے ہیں۔ جب رہتے ہیں۔ تو ایک سے مکانوں میں رہتے ہیں۔ جب سوچتے ہیں۔ تو سب ایک قسم کے مسائل پر سوچتے ہیں۔ برخلاف اس کے اگر ہندوستان میں دیکھو۔ تو ایک شخص کا لباس دوسرے سے نہیں ملتا۔ اگر مسلمان نے ایک لباس پہنا ہے۔ تو ہندو وہ نہیں پہنیگا۔ کہ مسلمان نظر نہ آئے اگر ہندو نے کوئی چیز پہنی ہے۔ تو مسلمان نہیں پہنے گا۔ کہ ہندو بن جائیگا۔ یورپ میں کسی شخص کا مذہب یا قومیت اس کے لباس سے معلوم کرنا ناممکن ہے۔ ہندوستان میں پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ لباس کافی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی انگریزی لباس پہنتا ہے کوئی نیم انگریزی۔ کوئی ¾ انگریزی۔ کوئی بالکل دیسی۔ پھر ان کی اقسام ہیں۔ ہندو انگریزی۔ ہندو نیم انگریزی۔ مسلمان انگریزی۔ مسلمان نیم انگریزی وغیرہ۔ غرضیکہ مقررہ قاعدہ کوئی نہیں۔ یہ علامت اس بات کی ہے۔ کہ ملک میں ایسے قوی اثرات کم ہیں۔ جو بہت سے لوگوں پر ایک ہی اثر کریں۔ تاکہ وہ ایک رنگ میں ظاہر ہوں۔ یہ اطاعت کا اصول دن بدن مضبوط ہوتا جاتا ہے۔ اور جتنی آزادی کی پکار زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اتنی ہی اطاعت بڑھتی جاتی ہے۔ بولشویک غالباً سب سے سنئے

آزادی کے حامی پیدا ہوئے ہیں۔ مگر ان کا آزادی سے مطلب مطلق آزادی نہیں۔ بلکہ مزدور پیشہ لوگوں کی ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کے پنجے سے آزادی ہے۔ ورنہ بالشویکوں کے ہاں اطاعت کا قانون سب سے سخت ہے۔ خود لینن لکھتا ہے۔ کہ جب تک انسانی فطرت وہ ہے جسکو ہم مشاہدہ کرتے ہیں۔ تب تک افسری اور ماتحتی اور اطاعت کے بغیر چارہ نہیں۔ غرضیکہ یہ اطاعت کی صفت ہے۔ جو عموماً ایشیائی لوگوں میں کم ہے۔ کم بھی ہے۔ اور ایک معنون میں زیادہ بھی ہے۔ جہاں اطاعت مجبوری کی اطاعت ہو۔ وہاں ایشیائی اور ہندوستانی فرمانبردار ہیں۔ مگر جہاں یہ معلوم ہو۔ کہ خوشی کی اطاعت ہے۔ مجبوری نہیں۔ وہاں ان لوگوں جیسی سرکشی کسی قوم میں نہیں۔ اسی لئے اکثر انجمنوں میں فریق مغلوب فریق غالب سے الگ ہو جاتے ہیں۔ اور جماعت میں تفریق ہو جاتی ہے۔ اپنے انتخاب کردہ افسروں کی نافرمانی بھی اسی لئے کرتے ہیں۔ کہ ہم نے خود انتخاب کیا ہے۔ پھر ہمیں انکے آگے جھکنے کی کیا ضرورت ہے

جاپان ایشیا کی اقوام میں سے مستثنیٰ ہے۔ جاپان کو قدرت نے قوت کے دونوں ذریعے عطا کئے ہیں۔ یورپ کی طاقت سے آگاہ ہوتے ہی انہوں نے مادی اسباب کی طرف توجہ کی۔ اور اطاعت کا اصول خود ان کی قوم میں قدیم زمانے سے موجود تھا۔ ہر جاپانی اپنا مذہبی فرض سمجھتا ہے۔ کہ شاہنشاہ کے حکم پر بے چون وچرا اپنی جان تک قربان کر دے۔ پس ایک شاہنشاہ کے وجود کی وجہ سے جس کو لوگ دیوتاؤں کی اولاد میں سے خیال کرتے ہیں۔ ملک کی تمام قوتیں ایک مرکز پر جمع ہو گئیں۔

پس ہندوستان کے لئے صنعت کے ساتھ یہ ضرورت ہے۔ کہ لوگ مشترک اغراض کو سمجھیں۔ ان کو اپنی ذاتی اغراض پر ترجیح دیں۔ اور فریق غالب اور اپنے افسروں کی اطاعت کا فن سیکھیں

جب تک ملک کے لوگ عام طور پر اطاعت میں مشاق نہ ہو جائیں۔ کوئی تجارتی صنعتی یا علمی اور سیاسی کام۔ بڑے پیمانے پر ممکن نہیں۔ اطاعت کا فن کتابیں پڑھنے سے نہیں آ سکتا۔ بلکہ صرف اطاعت کرنے ہی سے آتا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے۔ کہ ملک میں انجمنوں کی ایک کثیر تعداد ہو۔ تاکہ ملک میں کوئی آدمی نہ رہے۔ جو کسی انجمن کا ممبر نہ ہو۔ ان انجمنوں کی غرض کیا ہو؟ تعلیم صنعت۔ تفریح۔ سیاست کوئی غرض ہو۔ ہمارے نزدیک اغراض اس قدر ضروری نہیں۔ جس قدر تربیت ضروری ہے۔ ترقی کا پہلا زینہ ہندوستان اس وقت طے کریگا۔ جب

ان انجمنوں کے ذریعہ سے ملک میں افراد کم ہو جائیں گے۔ اس وقت ہندوستان کی آبادی تینتیس کروڑ افراد پر مشتمل ہے۔ ترقی تب ہوگی۔ جب کم ہوتے ہوتے ایک ہزار یا اس سے بھی کم انجمنوں تک محدود ہو جائیگی۔ اس وقت ایک طوفان بے تمیزی برپا ہے۔ نہ کسی کی کوئی سنتا ہے۔ نہ کوئی سنا سکتا ہے۔ سوائے ایک محدود سیاسی جماعت یا گورنمنٹ کے جو منتظم ہیں۔ باقی تمام ملک ریت کے ذروں کی طرح ہے۔ ان لوگوں کا کوئی کام ملکر کرنا ایسا ہی مشکل ہے۔ جیسے ریت کی رسی بنانا۔ پس بڑی ضرورت اس بات کی ہے۔ کہ لوگوں میں اجتماعی زندگی کا احساس پیدا کیا جائے۔ غالباً فوراً لوگوں کا کسی ایک خاص سیاسی یا غیر سیاسی پروگرام کو قبول کرنا مشکل ہوگا۔ اس لئے پروگرام کا سوال درمیان سے اٹھا دینا چاہئیے۔ ہر فرد کسی جماعت کا جزو بن کر رہے۔ اپنی آزادی کو ترک کردے۔ پابند ہو کر رہے۔ ہر جماعت اپنا پروگرام اپنی کثرت رائے سے خود بنائے۔ اور پھر تمام ممبر اس کے فیصلوں کے پابند ہوں۔ خواہ یہ پروگرام زیادہ حقوق پر مشتمل ہو۔ یا موجودہ حقوق پر مطمئن ہو۔ یا ان سے بھی کم حقوق کا خواہشمند ہو۔ کوئی جماعت

دوسری جماعت سے اعتراض نہ کرے۔ جماعتوں کا محض وجود ہی ملک کے لئے مفید ہے۔ خواہ ان کی اغراض بعض لوگوں کی نظروں میں کیسی ہی حقیر ہوں۔ اس وقت یہ حالت ہے۔ کہ اگر چند غنڈے مل کر چاہیں کہ ایک بڑے شہر کو تنگ کریں۔ تو کر سکتے ہیں۔ شہر کے ہزاروں آدمیوں میں اتنی قابلیت بھی نہیں۔ کہ وہ دس آدمیوں کا مقابلہ کر سکیں برخلاف اس کے انگلستان ہی کو دیکھیں۔ تو ہر شہر میں لبرل کلب۔ کنسرویٹو کلب لیبر کلب موجود ہے۔ ٹریڈ یونین الگ ہیں۔ جن میں قریباً تمام مزدور شامل ہیں۔ جرمنی میں علاوہ ان تمام جماعتوں کے بائیس ہزار سے زیادہ کوآپریٹو سوسائٹیاں ہی ہیں۔ جن کا کام مشترک سرمایے سے ضرورت کی اشیاء بہم پہونچانا اور قرض دینا ہے۔ اگر رہنمایان ملک ابتدا میں اس بات کی کوشش نہ کریں۔ کہ سب لوگ ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں۔ اور جو ان کے ساتھ شامل نہ ہوں۔ وہ کافر اور زندیق نہ قرار دئے جائیں۔ یا باقی لوگ اس بات کی پرواہ نہ کریں۔ کہ وہ کس پلیٹ فارم پر ہیں۔ بلکہ کوشش یہ ہو۔ کہ ہر شخص کسی نہ کسی پلیٹ فارم پر مزدور ہو۔ مگر اپنی خواہش اور اپنے ارادے سے ہو۔ نہ کسی اور کے خوش کرنے کیلئے۔ قومی اغراض کے لئے۔ نہ کہ ذاتی اغراض کے لئے۔ خواہ قومی اغراض ان کے ذہن میں کچھ ہی ہوں۔ غرضیکہ ہر شخص اگر اپنے خیال کے مطابق سچائی سے کسی جماعت کا ممبر ہو۔ اور تمام ملک میں ایسی چار پانچ جماعتیں ہوں۔ جو قریباً تمام اہل ملک پر حاوی ہوں۔ تو یہ صورت ملک کے لئے بہتر ہوگی بہ نسبت موجودہ حالت کے جب ایک قلیل حصہ ملک جنگ کے لئے کھڑا ہے۔ اور باقی تمام لوگ جن میں بہت سے سمجھ دار اور نیک نیت اشخاص بھی ہیں۔ کالمیت فی ید الغسال ہیں۔ ایسے ملک میں جس میں ہر شخص کی نظر اپنے گھر کی چار دیواری میں بند رہنے کی عادی ہو۔ اور اس کو مشترک اغراض یا اجتماعی

زندگی کی قدر و قیمت معلوم نہ ہو۔ یہ توقع کرنا۔ کہ وہ فوراً ایک رائے پر متحد ہو کر اس پر عمل کرنے لگیں گے۔ غلطی ہے۔ ایسے حالات میں سب سے پہلے یہ ضروری ہے۔ کہ لوگ اجتماعی زندگی کی تربیت حاصل کریں۔ اور وہ اس طرح پر ہو سکتا ہے۔ کہ ہر شخص کسی نہ کسی انجمن کا نہ صرف کاغذ پر بلکہ صحیح معنوں میں ممبر ہو۔ اور یہ انجمنیں کسی ایسے کام کا تہیہ نہ کریں۔ جس کی ان میں طاقت نہیں ہے۔ اور اگر انجمن بناتے ہی بغیر تربیت اور تجربے کے آسمان تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ تو اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

ختم شد

۲۹۷۶۹۸

آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائے گا۔